

مولانا محمد ایوب دہلوی

پیشکش : حفیظ الرحمٰن

مولانا محمد ایوب دہلوی

پیشکش : حفیظ الرحمٰن

فہرست

سوانح مولانا محمد ایوب دہلوی

https://www.scholars.pk/ur/scholar/hazrat-allama-hafiz-muhammad-ayub-dehlvi

رئیس المتکلمین علامہ حافظ محمد ایوب دہلوی بن عبدالرحمٰن، محلہ کوچہ قابل عطار، دہلی (بھارت) میں 1888ء کو تولد ہوئے۔ شیخ عبد الرحمٰن دہلی میں تجارت کرتے تھے۔

تعلیم و تربیت : ابتدائی تعلیم اپنے گھر سے حاصل کی، اس کے بعد قرآن حکیم کی لازوال دولت سے سرفراز ہوئے۔ بعد ازاں وقت کے مشاہیرِ علماء سے شرف تلمیذ حاصل کیا، اس کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ ملا واحدی کی خوش نوش کتاب 'دلی جو ایک شہر تھا' سے معلوم ہوا کہ انہوں نے عظیم ریاضی دان علامہ مولانا محمد اسحاق رامپوری سے بھی استفادہ کیا تھا۔ بہت حال مختلف علمائے کرام سے درسِ نظامی کر کے فارغ التحصیل ہوئے۔ علامہ موصوف کتاب و سنت کے ساتھ منطق و فلسفہ میں کمال درجے کے عالم و فاضل تھے۔ صاحب تصنیف قادرُ الکلام خطیب اور متوکل صوفی تھے۔ بلا کے ذہین، فطین، طبع اخذ اور مزاج نقاد تھا۔

بیعت : آپ فرماتے تھے کہ 'میں نے حضرت خواجہ غریب نواز سید معینُ الدین چشتی اجمیری قدس سرہ سے روحانی طور پر بیعت کرلی ہے ، اس سے فیضیاب ہوں ۔ دہلی میں ایک درویش رہتے تھے مولانا نے ایک مدت تک ان کی صحبت میں رہ کران کی خوب خدمت انجام دی ، ان سے بھی فیضیاب ہوئے (بروایت محمد زین العابدین)

شادی واولاد : آپ نے دہلی میں عجائب خانم خاتون سے شادی کی جس سے آٹھ (8) لڑکے اور آٹھ (8) لڑکیاں تولد ہوئیں ۔ ان میں سے بعض بچے بچپن میں فوت ہوئے : محمد خالد مرحوم ، محمد خضر مرحوم ، محمد رفیع مرحوم ، محمد یامین مرحوم ، محمد صالح مرحوم ، محمد زین العابدین مرحوم ، محمد فیروز مرحوم ۔

دامادوں کے نام : محمدالدین پراچہ (پراچہ ہاؤس اردو بازار کراچی)، محمد فرید (مالک فریسکو بیکرز، فریسکو چونک برنس روڈ کراچی)، سرفراز خان، امیر حَسن، عبدالحمید، معراج محمد۔

حلقۂ احباب : مولانا سیدنا جلالی دہلوی، مولانا سید السلام باندوی، مولانا سید منتخب الحق قادری، مولانا مفتی محمد عمر نعیمی، مولانا امیر احمد انصاری جودھپورہ، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا محمد شفیع اوکاڑوی وغیرہ وغیرہ۔

معتقدین : آپ کے صحبت میں بیٹھنے، درس میں شرکت کرنے والے، استفادہ کرنے والے کوشہ چین، معتقدین و محبین کی فہرست طویل ہے۔ آپ کے درس میں اہلِ علم فاضل اور نامور شخصیات شرکت کرتی تھیں، ان میں سے بعض اسمائے گرامی درج ذیل ہیں :

نامور دانشور ملا واحدی (کراچی)، حکیم محمد سعید بانی ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی، محترم سخی سید شوکت علی دہلوی مرحوم بانی مکتبہ رازی کراچی، مولانا عزیزالحق عزیز ڈپٹی سیکریٹری حکومت پاکستان (کراچی)، محمود احمد خان ریٹائرڈ الیکشن کمشنر سندھ کراچی (نے آپ کی کتاب "ختمِ نبوت" کا انگلش ترجمہ کیا جسے مکتبہ رازی نے آب و تاب کے ساتھ شائع کیا) حکیم فاروقی ہندوستانی دواخانہ گارڈن، حکیم حافظ محمد محسن الدین احمد صاحب بقائی ٹھٹھائی کمپاؤنڈ/شمالی ناظم آباد (کراچی)، خان بہادر شیخ حبیب الرحمٰن، حاجی محمد صالح دہلوی، دلی کے مشہور پنجابی سوداگر، حاجی شیخ محمد خلیل سوت والے (کھارادر)، ڈاکٹر رفیع الدین ملتانی سیکریٹری حکومت (کراچی)، اسلم ملتانی، حاجی محمد صدیق طیبی سینٹر نیو چالی کراچی وغیرہ۔

سفر حرمین شریفین : آپ نے 1966ء کو حرمین شریفین کا سفر اختیار کیا۔ مکہ مکرمہ میں عمرہ ادا کیا مدینہ منورہ میں روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری کی سعادت ابدی حاصل کی اور نہایت عقیدت واحترام سے درود اسلام کا نذرانہ پیش کیا۔ یاد رہے کہ آپ کو حج کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔

خطابت : آپ ہر اتوار کو درس یاد کرتے تھے ایک اتوار کو حکیم حافظ محمد سعید دہلوی شہید (بانی ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی) کے گھر شکارپور کالونی نزد مزائد پر۔ دوسرے اتوار کو اسد ملتانی (سیکریٹری حکومت پاکستان) کی کوٹھی 10 ڈی گارڈن روڈ کراچی پر. جس میں قرآن و حدیث کے ساتھ فلسفہ و منطق پر سیر حاصل گفتگو ہوا کرتی تھی، درسِ قرآن ہوا کرتا تھا۔ جس میں قرآن حکیم کی تفسیر تشریح اور علمی نکات

بیان کیئے جاتے تھے۔ ان دروس میں حاضرین کو کوئی بھی سوال دریافت کرنے کی کھلی اجازت ہوا کرتی تھی۔ ان تقاریر کو آڈیو کیسٹ کا خزانہ ہمدرد لائبریری بیت الحکمت میں محفوظ ہے، اس کے علاوہ بھی مختلف حضرات مثلاً حاجی محمد صدیق (الیوسف چیمبر شاہراہ لیاقت کراچی)، الحاج سید شوکت علی دہلوی مرحوم (کراچی)، اور حکیم محمد عبد اللہ قادری (کراچی) وغیرہ کے پاس محفوظ ہیں۔

خطابت کی جھلکیاں: رئیس المتکلمین علامہ حافظ ایوب دہلوی محفل درس فرمایا کرتے تھے، ہر اس مجلس میں جانا چاہیئے کہ جہاں نبی علیہ السلام کی تعظیم کی جارہی ہو اور اس مجلس میں نہیں جانا چاہیئے جہاں نبی علیہ السلام کی بے ادبی ہو رہی ہو، حرام ہے، گناہ ہے۔ 'یا رسول اللہ' میں کیا جھگڑا ہے حضرت شاہ عبدالعزیز ایسے بزرگ ہیں جن کو

سب مانتے ہیں، دیوبندی، بریلوی اور غیر مقلد تینوں متفق ہیں۔ وہ فرماتے ہیں

'یا صاحب الجمال ویا سید البشر،
من وجہک المنیر وقد نور القمر،
لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔'

شاہ عبد العزیز ایسے بزرگ ہیں کہ (میری نظر میں) سارے عالَم میں ان کے برابر کا کوئی عالم نہیں تھا۔ جب انھوں نے 'یا' کہہ کر پکارا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ہمارے اُستادوں کا سلسلہ ان سے (شاہ عبد العزیز سے) ملتا ہے۔ مذہبی چیزوں میں آئمہ اربعہ کو بزرگ جانتا ہوں اور حنفی مذہب کا پیروکار ہوں۔ ہر مذہب والا اپنے مذہب کو افضل

کہتا ہے، میں بھی اپنے مذہب کو افضل کہتا ہوں۔ (مقالات ایوبی جلد اول ص 262 مطبوعہ مکتبہ رازی کراچی ندارد)

چند اہلِ حدیث (غیر مقلد) درس میں بیٹھا کرتے تھے (ایک روز) میں نے رد کر دیا، تو وہ مجھ سے ناراض ہو گئے، ہو جاؤ، غیر مقلدی غلط چیز ہے اس سے بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ چاروں امام حق پر ہیں، ان کی تقلید جو نہیں کرے گا تو گمراہ ہو گا۔ (مقالات ایوبی جلد اول ص 260 مطبوعہ مکتبہ رازی کراچی ندارد)

قیامت تک جتنے اولیاء اللہ ہیں ان کے مجموعے سے ایک ادنیٰ صحابی کو افضل مانتا ہوں، یہ میرا عقیدہ ہے۔ تمام اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جنتی مانتا ہوں، اس میں کوئی شک وشبہ نہیں سمجھتا اور جو بات مانتا ہوں اس کے لئے دلیل ہوتی ہے (مقالات ایوبی جلد اول ص 293 مطبوعہ مکتبہ رازی کراچی ندارد)

مجتہد اگر غلطی کرے گا تو اس کو ایک انعام ملے گا۔ اگر ٹھیک کرے گا تو دو انعام ملیں گے۔ چاروں امام حق پر ہیں، تمام مجتہدین حق پر ہیں، تمام اولیاء اللہ اور ارباب کشف حق پر ہیں، یہ میرا عقیدہ ہے۔

(مقالات ایوبی جلد اول ص 295 مطبوعہ مکتبہ رازی کراچی ندارد)

تصنیف و تالیف: آپ کے علمی دروس کو آپ کے محبین و متوسلین نے آڈیو کیسٹ میں محفوظ کر لیا تھا، جس سے نقل کر کے کتابیں تیار کر کے آپ کی زندگی اور اس کے بعد شائع کر کے مفت تقسیم کی گئی۔ ریٹائرڈ پروفیسر محمد نعیم (کالا بورڈ ملیر) علامہ موصوف کے درس میں اکثر شرکت فرماتے تھے انھوں نے ایک ملاقات میں راقم فقیر کو بتایا کہ ''وہ تاجرانہ بنیاد پر کتابیں شائع کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔'' وہ فرماتے ہیں کہ ''وسائل ہیں تو شائع کر کے

مفت تقسیم کریں۔'' اس سلسلہ میں وہ چندہ جمع کرنے کے حق میں بھی نہیں تھے۔ ان کا اللہ عزوجل کی ذات پر کامل بھروسہ تھا۔ وہ فرماتے تھے 'جس کام کا ہونا ہے۔ وہ ضرور ہو کر رہے گا۔' وہ کامل متوکل تھے۔ آپ کی بعض کتابوں کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

تفسیر ایوبی : حصہ اول جس میں "اعوذ، بسم اللہ اور سورۃ الفاتحہ کی تفسیر

حصہ دوم میں سورت بقرۃ رکوع اول کی تفسیر، سوا چار سو صفحات پر مشتمل ہے مطبوعہ مکتبہ رازی شارع محمد بن قاسم روڈ کراچی۔

فتنہ انکارِ حدیث : فرقہ پرویزی کے (بانی غلام احمد پرویز ایڈیٹر ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور) کے رد میں لکھی گئی۔ مولانا نے نہایت مدلل اور معقول جواب دیئے ہیں۔ مکتبہ نے اردو، انگریزی، عربی اور

فرنچ میں شائع کیا، اس کا ایک ایڈیشن اے بی المعاشی برادرز ائل انڈسٹریز کراچی نے شائع کیا ہے۔

ختمِ نبوت: قادیانیت کے رد میں شاہکار رسالہ ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی کثیر تعداد میں شائع ہوا اور فرانسیسی زبان میں بھی ترجمہ چھپ کر ہزاروں کی تعداد میں افریقہ میں مفت تقسیم ہو چکا ہے، اس کے بعد مکتبہ نے عربی میں شائع کیا۔ صدیقی ٹرسٹ کراچی نے 'ثمرۃ الکون' کو 1982ء میں اور فتنہ انکارِ الحدیث (عربی) کو 1983ء میں دو ہزار اڈیشن شائع کیے۔

مقصودِ کائنات: اس کا ماحصل یہ ہے کہ 'مقصودِ کائنات' حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی قدر ہے، مکتبہ رازی نے اس رسالہ کا ترجمہ عربی 'ثمرۃ الکون' کے نام سے شائع کیا۔

مقالات ایوبی : (3 جلدیں) مطبوعہ مکتبہ رازی، 15 شہاب مینشن محمد بن قاسم روڈ کراچی۔

تحقیق الکلام : مسئلہ جبر و قدر :

منکرینِ حدیث اور قربانی : فقری نے علامہ ایوب کی کتب کی اشاعت کا جو جائزہ پیش کیا ہے، اس سے بخوبی علامہ کی تالیفات کی عوام الناس میں مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ وقت کا تقاضا و ضرورت ہے کہ علامہ کی تین سو کیسٹ میں جو تقاریر مختلف علوم و فنون پر مشتمل پھیلی ہوئی ہیں، انہیں کاغذ پر منتقل کر کے کتابی صورت میں شائع کرنے کا اہتمام کیا جانا چاہیئے۔

عادات وخصائل : رازی زماں علامہ ایوب کے قریبی صحبت یافتہ سید صاحب جناب الحاج شوکت علی دہلوی کراچی نے آپ کی تصویر کو اپنے قلم سے یوں کھینچا ہے موصوف رقم طراز ہیں :۔

''بلند اور کشادہ پیشانی ، بڑی بڑی روشن مقناطیسی کشش رکھنے والی آنکھیں ، خوبصورت داڑھی ، رنگ ملیح ، صورت میں دلکشی ، چہرے پر فکر و تحقیق اور ذہانت و فراست کے انوار ، موزوں قد ، رعب و دبدبہ اور جلال و جمال سے آراستہ ، لیکن بہت معمولی لباس کرتہ کا گریبان کھلا ہوا ، سر پر دو پلی ٹوپی ، پاؤں میں ادھوڑی استر کی جوتی ، کثرت سے پان کھانے کے باعث دانت اور ہونٹ رنگین اور کپڑوں میں جگہ جگہ پیک کے دھبے یہ حلیہ ہے اس ہستی کا جسے مولانا ایوب کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔

دلی کے رہنے والے، دلی کی زبان بولنے والے، معقولات کے بادشاہ، فلسفہ کے امام اور فکر و تحقیق میں اپنی مثال آپ، قرآن پاک پر بے پایاں عبور حاصل تھا۔ جب رموز قرآن بیان کرتے تو معلوم ہوتا تھا کہ آبشار گر رہی ہے اور تلل روانی، زور بیان میں کبھی جھول نہیں آتا تھا۔ تکلف و بناوٹ سے پاک، بے نیاز اور ساتھ ہی محبت و مروت اور خداترسی کی صفات سے زندگی مرصع تھی'' (پیش لفظ)

مولانا پیسے کے حوالے سے کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ دن بھر خالق دینا ہال کے سامنے کپڑے کی مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ کراچی میں لٹھا کی دوکان پر بیٹھتے تھے۔ کسی مسجد میں امامت وخطابت ان کا معمول نہیں تھا۔ وہ کسی دارالعلوم سے بھی منسلک نہیں تھے۔ ان کی الگ تھلگ دنیا تھی، اپنی دنیا میں مشغول و مصروف رہا کرتے تھے۔ وہ دین کی خدمت فی سبیل اللہ کرتے تھے، وہ فیس مقرر کر

کے کسی جلسہ میں جانے کو بہت بُرا سمجھتے تھے، اسی لئے تقریباً نہیں جاتے تھے۔ اپنی تشہیر کو سخت ناپسند کرتے، غالباً اس لئے آپ کی کسی کتاب میں بھی سوانح منسلک نہیں ہے۔ وہ گم نامی و گوشہ نشینی کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ سیدھے سادھے بے نفس، سادہ مزاج، صاف گو، عظیم انسان تھے۔ وہ لباس سے نہیں پہچانے جاتے تھے کہ یہ وہ عالم ہیں جس کی نظر نہیں۔ معمولی سا لباس زیب تن فرماتے گدڑی میں لعل کے مصداق معلوم ہوتے۔

پروفیسر نعیم صاحب نے بتایا کہ وہ فرماتے تھے ''تم لوگ درس میں آتے تو ہو لیکن اس کی تشہیر کبھی نہیں کرنا۔'' وہ اس چیز پر سب سے عہد لیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے ''جنھیں درس میں آنا نصیب ہے وہ ضرور آ کر رہے گا اس لئے تشہیر نمائش کی ضرورت نہیں۔''

وہ نہیں چاہتے تھے کہ اشتہارات میں ان کا نام نمایاں اور القابات سے شائع ہو، اس لئے کسی جلسہ میں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔

صاحبزادہ محمد زین العابدین صاحب نے بتایا کہ وہ ساداتِ کرام کا نہایت احترام کرتے تھے۔ سادات پر زکوٰۃ کو حرام سمجھتے تھے۔ جھوٹ سے نفرت رکھتے تھے اور حق سچ کا ساتھ دیتے تھے۔ ایک صاحب کے ان کی طرف نو (9) ہزار روپے تھے لیکن وہ پاکستان آ کر بھول گئے، لیکن مولانا نے قیام پاکستان کے بعد انہیں یاد دلا کر پوری رقم واپس لوٹا دی۔ ایک بار ایک صاحب دوکان پر حاضر ہوئے وہ ان سے کہنے لگے ''بلینک چیک لیں اور یہ لکھ کر دیں کہ عیسائیت، قادیانیت، پرویزیت اور غیر مقلدیت کا رد نہیں کریں گے۔'' لیکن اس مردِ خدا نے سختی سے دو ٹوک الفاظ میں وہ پیشکش ٹھکرا دی۔ وہ کہتے تھے کہ 'میں دربارِ رسالت میں بک چکا ہوں، اب کوئی میری بولی

نہیں لگا سکتا۔' وہ بکنے جھکنے اور دبنے والے انسان نہیں تھے بلکہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے غلام اور دین اسلام کے مخلص سپاہی تھے۔ وہ سخی تھے، راہِ خدا میں لُٹانا جانتے تھے۔ سارے دن کی کمائی میں سے گھر کا خرچہ نکال کر بقیہ رقم اہل ضرورت، سفید پوش، محتاجوں اور بیوہ خواتین پر خرچ کر دیتے تھے۔

مولانا مرحوم کتب خانہ و کتب بینی کی حاجت سے آزاد تھے۔ انہیں رب کریم نے وہبی علم عطا فرمایا تھا، وہ نہ لکھتے تھے نہ پڑھتے تھے۔ ان کے معمولات اس طرح تھے کہ روزانہ فجر پڑھ کر، ناشتہ کرتے اس کے بعد کھارادر سے بس میں بیٹھ کر برنس روڈ آتے، گوشت، سبزی وغیرہ خرید کر لائن میں لگے ہوئے فقیروں کو خیرات دیتے ہوئے واپس گھر آتے، پھر وہاں سے بس میں بیٹھ کر لائٹ ہاؤس دوکان پر چلے جاتے حلال روزی کماتے۔ شام گھر واپس ہوتے عشاء کے بعد

سوتے، یہ ہیں ان کے معمولات زندگی۔ ان کے فیض یافتہ شاگرد ملا واحدی لکھتے ہیں:

''افسوس انہیں لکھنے کی مشق نہیں تھی، وہی زبان جو تقریر میں استعمال کرتے تھے تحریر میں استعمال کرسکتے تو بلا مبالغہ امام غزالی علیہ رحمہ کی طرح حیات جاوید پالیتے۔ مجھے چودھویں صدی ہجری کی عظیم ترین علماء و مشائخ سے شرف نیازمندی حاصل رہا۔ میں نے علم کے سمندر میں غوطہ خور عالم اور غزالی صفت درویش مولانا ایوب دہلوی جیسا نہیں پایا۔'' ('مولانا ایوب جنہوں نے دین کی تجارت کبھی نہیں کی'، مضمون نگار: ملا واحدی، روزنامہ جنگ کراچی 20 دسمبر 1969)

تاثرات : نامور قانون دان و اسکالر، اے کے بروہی مرحوم آپ کے متعلق اپنے تاثرات میں لکھتے ہیں : ۔

'ان کے قرآن شریف کے اس عمیق مطالعے اور اسلام کی روح کی سوجھ بوجھ سے میں بہت متاثر ہوا ہوں، مجھے اس بارے میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ ہمارے ملک کے نوجوان کی آئندہ نسل کے لئے ان کے خیالات کا گہر مطالعہ قرآن شریف کو صحیح سمجھنے اور پیغمبر اسلام کے ارشادات کی اہمیت کو بخوبی سمجھنے میں کافی حد تک مددو معاون ثابت ہوں گے ۔' (مقالات ایوبی جلد اول)

نامور اسکالر ماہر تعلیم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی رقم طراز ہیں : ۔

'علامہ حافظ محمد ایوب صاحب مرحوم و مغفور کی خدمت میں جن اہلِ علم کو حاضری کا موقع ملتا تھا، وہ ان کے تبحرِ علمی کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ علامہ موصوف کو علوم معقول و منقول میں حیرت انگیز دستگاہ تھی۔ اس زمانے میں ایسے علماء جو علمُ الکلام میں اس درجہ امتیازی قابلیت کے حامل ہوں نظر نہیں آتے۔ منطق و فلسفہ اور قرآن و حدیث کے علوم کا ایسا امتزاج دوسروں کی تصانیف میں مشکل سے ملتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مولانا کا علم اس قدر حاضر تھا کہ ان کی تقریر معانی و معارف سے لبریز ہوتی تھی۔ وہ بے تکان مسلسل ایسی علمی تقریر کرتے تھے کہ دوسروں کو غرق ریزی اور مطالعے کے بعد بھی تحریر تک میں وہ بات پیدا کرنی دشوار ہوتی تھی۔ ان کے برجستہ ارشادات نکات و حقائق کا خزینہ ہوتے تھے۔'

(مقصودِ کائنات)

قائداعظم اکیڈمی کے ریسرچ اسکالر خواجہ رضی حیدر صاحب علامہ موصوف کی علمیت کے معترف اوران کی خودداری وصاف گوئی اور سادگی کے گیت گاتے رہتے تھے۔

محترم حاتم وقت سید شوکت علی مرحوم (والد سید فصاحت علی) نے اپنی ریٹائرمنٹ سے مولانا ایوب مرحوم کی کیسٹ سے تقاریر علمی کاغذ پر نقل کرواکے کتابیں ترتیب دے کر ملک و بیرون ملک مفت تقسیم فرمائیں۔ اس کام کے لئے اہل علم کا بورڈاورمکتبہ رازی کو قائم فرماکرایک اہم و منفرد خدمت سرانجام دی تھیں۔ آپ کی اشاعت سے اہل علم ہمیشہ استفادہ کرتے رہیں گے اوراہل درد آپ کوقدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اجر دیتا رہے گا۔

آپ کا عمل اہل ثروت مخیر حضرات کے لئے ایک نمونہ ہے۔

وصال : رازی زمان علامہ الدیوان مولانا حافظ محمد ایوب دہلوی نے 4 شوال المکرم 1389ھ بمطابق 13، دسمبر 1969ء بروز پیر 81 برس کی عمر کو کراچی میں انتقال کیا۔ آپ کا مزار دھوبی گھاٹ کے متصل پورہ لیاری کے قبرستان میں ہے۔ جو کہ دہلی قوم سوداگران کی ملکیت ہے۔

(سید فصاحت علی صاحب نے علامہ مرحوم کی بعض دستیاب کتابیں مہیا کی اور صوتی ربانی صاحب کی پر خلوص کوشش سے علامہ مرحوم کے صاحبزادے محمد زین العابدین صاحب سے فریسکو چوک کے قریب ایک سادہ ویرانے فلیٹ میں بالمشافہ ملاقات ہوئی۔ دوسری ملاقات میں انہوں نے اپنے والد محترم کے متعلق سوانح لکھوائی اور ملا

واحدی کے مطبوعہ مضمون والا اخبار کا تراشہ مرحمت فرمایا۔ فقیر تمام معاونین کا مشکور رہے)

* *

ایک بڑے آدمی کے بارے میں

گفتگو: احمد جاوید صاحب

(ترتیب: محمد سعد چودھری)

14 اکتوبر 2021

https://jaeza.pk/yad-nigari/maulanamuhammadayubdehlvi-ahmadjavaid/

نوٹ : استاد گرامی جناب احمد جاوید صاحب نے مولانا حافظ محمد ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق ایک گفتگو ریکارڈ کروائی تھی جس کو اس لنک

https://youtu.be/5Rk8mZnzd3Y

سے حاصل کیا جا سکتا ہے ۔ ہماری معلومات کے مطابق، جناب احمد جاوید صاحب نے تین اقساط میں گفتگو کرنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن تا حال صرف ایک ہی قسط شائع ہو پائی ۔ ہمارے نوجوان دوست محمد سعد چودھری نے اسی پہلی قسط کی ریکارڈنگ کو تحریری متن کے قالب میں ڈھالا ہے ۔

مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فقرہ میں نے پڑھا تھا، اوائل جوانی میں، ان کے رسالے میں ۔ شعور کی سب سے گہرائی

میں ایک لوح ہوتی ہے جس لوح پر کوئی چیز اگر لکھ دی جائے تو وہ کبھی مٹتی نہیں ہے، پہلی مرتبہ پڑھنے کے بعد ہی یہ فقرہ اس لوح پر لکھا گیا۔

وہ وقت ہے اور آج کا وقت ہے کہ اس فقرے کی حرارت، اس فقرے میں چھپی ہوئی شانِ ہدایت، اس فقرے میں زندگی بن جانے کی قوت اور اس فقرے میں پوشیدہ جوہرِ شعور ہو سکنے کی صلاحیت، روزانہ ایک نئے رنگ میں میرے تجربے میں آتی ہے۔ وہ فقرہ یہ تھا:۔

'دین داری نام ہے فکرِ آخرت اور اعتماد علی السلف کا'

مسلمان ہونے کے لیے جن نفسیاتی محرکات اور مسلمان کو نفس کی جن حالتوں کی مستقلاً تسلسل کے ساتھ ضرورت رہتی ہے ان میں ایک کنڈیشن یہ ہے کہ آدمی اپنے مسلمان ہونے کو طبعی، نفسیاتی، ذہنی، کرداری، اخلاقی غرض کسی بھی سطح پر برقرار نہیں رکھ سکتا جب

تک کہ اس کے شعور میں فکر کی یعنی (concerned) کی یعنی فکر مندی کی جتنی بھی طاقت پائی جاتی ہے وہ ساری طاقت آخرت پر صرف ہو۔ یعنی شعور میں فکر مندی کا مادہ، آخرت کے تصور سے پیدا ہو اور فکر مندی کے اس مادے کی جتنی بھی

(manifestations) مظاہر ہوں ان سب کا براہِ راست یا بالواسطہ تعلق آخرت سے ہی ہو۔ یعنی سادہ لفظوں میں کہیں، تو مسلمان میں پریشانی کے تمام احوال، آخرت کو حاضر کر دیتے ہوں چاہے اس کے اسباب دنیاوی اور نفسیاتی ہی کیوں نہ ہوں۔ اور دوسری جو شرط، شعور اور نفسیاتِ اسلامی کی جو کنڈیشن اس فقرے میں ہے، وہ ہے 'اعتماد علی السلف' اپنے اسلاف پر اعتماد کرنا۔ اعتماد سے یہاں مراد یہ ہے کہ دین کو اس کی فارم میں بھی اسلاف

سے اخذ کرنا اور دین کو اس کے مقاصد حقائق اور معانی میں بھی اسلاف ہی سے اخذ کرنا اور دین داری کے تمام اوضاع اور احوال کو بھی اسلاف ہی کی سند پر قبول کرنا۔ یعنی اپنے فہم میں، اپنے حال میں، اپنے عمل میں، کسی دیندار آدمی کو ایک صحیح رخ پر دوام حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ سلف کی مخلصانہ، صادقانہ پیروی نہ کرے۔

دین جس تواتر اور تسلسل سے ہم تک پہنچا ہے. جس میں اس کی صورت اور معنی دونوں ہم تک پہنچی ہیں، ان دونوں کے واحد ذریعے کی حیثیت ہمارے اسلاف ہی تو رکھتے ہیں۔ میں نے اس سے جہاں اور بہت ساری باتیں سیکھیں وہاں ایک ضمنی طور پر یہ ایک معرفت بھی حاصل کی کہ اگر کسی شخص کو دیکھو کہ وہ اپنے بڑوں کا تذکرہ والہانہ پن، انہماک اور عاشقانہ عاجزی کے ساتھ نہیں کرتا۔ یہ

سمجھ لو کہ اس کے قلب میں ابھی دین اترا نہیں ہے۔ اور اس میں شدت اور تاکید کا رنگ پیدا کر کے کہا جائے تو اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے بلکہ کہنا چاہے کہ اللہ سے محبت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم سے محبت، اس وقت تک معلق، بے تاثیر، بلکہ بڑی حد تک بے معنی رہتی ہے جب تک وہ اسلاف کو ہمارا محبوب نہیں بناتی۔ جو مسلمان اسلاف کو محبوب نہیں رکھتا وہ گویا اللہ سے محبت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم سے محبت کو گنوانے پر تیار ہے یا انہیں حاصل کرنے کا شوق اور طبیعت نہیں رکھتا۔

اسی الہامی فقرے کے سائے سائے میں چلتے ہوئے، آج میں اپنے سلف میں سے ایک انتہائی ممتاز، محترم اور مکرم ہستی کا ذکر کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔ ان کا اسم مبارک ہے مولانا محمد ایوب صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ زیادہ معروف یہ اپنی زندگی میں تھے حافظ

محمد ایوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے ۔ ان کی علمی شان تو بعد میں حتی المقدور عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن سر دست میں یہ چاہتا ہوں کہ ان سے تعلق میں جو چیزیں پہلے اور اولین محرکات کی حیثیت رکھتی ہیں ان کا بیان ابتدا میں کر دیا جائے ۔ پھر اُس تعلق کی تکمیل میں ان کے جو اوصاف رہنمائی فرمایا کرتے ہیں، ان اوصاف کا جن کی بیشتر بناوٹ علمی اوصاف کی ہے، وہ بعد میں رکھیں۔

میں میٹرک کا طالب علم تھا، 1969ء کا سن تھا۔ شعر و ادب میں میرے محبوب استاد جو میرے لیے بڑے بھائی کی حیثیت رکھتے تھے والد کی حیثیت رکھتے تھے یعنی سلیم احمد صاحب، جن کے بارے میں یہ جملہ ایک سو ایک فیصد سچ ہے کہ اللہ نے انہیں ذہانت اور دوستی کے مجسمے کے طور پر خلق کیا تھا۔ ان کی شخصیت کے دو سب سے قیمتی عناصر یہ دو تھے کہ وہ انتہائی ذہین تھے، وہ کسی بھی نئے سے نئے

علم کی گہرائی میں اترنے کے لیے ایک آدھ دن سے زیادہ وقت نہیں لگاتے تھے۔ مطلب، جو علم ان کے لیے سر دست بالکل بھی نا معلوم ہوا کرتا تھا اگر انہیں اس علم کی تحصیل کی ضرورت پڑ جاتی تھی تو وہ ایک رات لگا کر اس علم سے ایسی شناسائی پیدا کر لیتے تھے جو ممکن ہے کہ اس کے بہت سے ماہرین میں نہ پائی جاتی ہو۔ ایک بار سن کر لمبی لمبی چیزوں کو یاد کر لیتے تھے۔ کوئی لمبی نظم سن لی وہ یاد ہو جاتی تھی تو اس کا تعلق بھی، حافظے کی خوبی کا تعلق بھی، ذہانت سے تھا، ان کے یہاں۔ دوسرا پہلو جو ان کی شخصیت کا محبوب ترین پہلو تھا، ان کے دوستوں کے لیے، ان کے شاگردوں کے لیے، ان کے عزیزوں کے لیے۔ وہ یہ تھا کہ وہ تعلق کے مادے سے بنا ہوا چلتا پھرتا وجود تھے۔ یعنی ان کی سب سے بڑی قوت، ان کی صلاحیتِ تعلق تھی۔

اللہ نے انسان کو جن جبری اور فطری نظامِ تعلقات کی پاسداری کرنے بھیجا ہے انھوں نے ان تمام تعلقات کو بہترین سطحِ ذمہ داری کے ساتھ اوران کے لیے درکار بہترین جذبات کے اظہاراور کارفرمائی کے ساتھ ادا کرکے دکھایا۔ یعنی تعلق کہتے ہیں ذمہ داری کو بھی اور جذبے کو بھی۔ تعلق میں ذمے داری نہ رہے، تو خلل پڑجاتا ہے اور تعلق میں اگر جذبہ شاملِ حال نہ ہو تو بھی تعلق ناقص ہے یعنی تعلق محض ذمہ داری نہیں ہے، تعلق محض جذبہ نہیں ہے۔ تو ان دونوں کے مل جانے سے تعلق کی تکمیل اور تصدیق ہوتی ہے۔

ہمارے سلیم بھائی جو ہیں وہ اپنے تعلقات میں، ہر قسم کے تعلقات میں اعلیٰ درجے کی ذمہ داری رکھتے تھے اور ہر قسم کے تعلق کی تکمیل، تشکیل، تصدیق اوراس کی مسلسل نمو کے لیے جس طرح کا جذبہ درکار ہوا کرتا ہے اُس جذبے میں بھی وہ انتہائی قوی تھے۔ وہ

جذبہ تعلق، ان کی شخصیت سے چھلک چھلک کر ان کے اہلِ تعلق میں منتقل ہوتا تھا۔ ان کے بارے میں ان کے دشمن اور مخالف کو بھی جن دو باتوں پر شک نہیں ہے وہ یہ تھیں کہ ان جیسا ذہین آدمی دیکھنے میں کم آتا ہے اور ان جیسا دوست آدمی، ان جیسا قوی التعلق بھی دیکھنے میں کم آتا ہے۔

ہمارے سلیم بھائی "مولانا ایوب صاحب" کی خدمت میں جایا کرتے تھے، ان کے دروس میں۔ مولانا کا تقریباً روز یا ہفتے میں چار دن، کہیں نا کہیں کوئی درس ہوا کرتا تھا۔ اس کی تفصیل میں عرض کرتا ہوں وہ کس طرح ہوتا تھا، وہ تھوڑی دیر بعد عرض کروں گا۔

سلیم بھائی مجھے پہلی مرتبہ مولانا کی ایک مجلس میں لے گئے جو مولانا کے گھر ہی میں تھی۔ اس میں بیس تیس آدمی تھے اور مولانا فعلِ الٰہی اور قولِ الٰہی کے درمیان کیا ربط ہے اور ان میں ترجیح کس کو ہے؟

اس موضوع پہ کلام فرمارہے تھے۔ تو وہاں میں نے یہ ایک عجیب منظر دیکھا کہ انتہائی مشکل لفظوں میں، ایک ایسی اتھارٹی کے ساتھ، جس سے پتہ چل رہا تھا کہ متکلم کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ سامنے کوئی بیٹھا ہوا ہے یا نہیں۔ اتھارٹی اسی کو کہتے ہیں نا کہ جسے دوسرے کی ضرورت نہ ہو۔ تو صاف (convey) ہو رہا تھا کہ انہیں اپنی باتیں کہنے کی تو خواہش ہے لیکن اس چیز سے کوئی دلچسپی نہیں کہ یہ بات سنی بھی جاتی ہے یا نہیں۔ ایک عجیب طرح کی بے نیازی ان سے چھلک رہی تھی۔ سلیم احمد تقریباً اس مجلس میں اور اس کے بعد کوئی چار گھنٹے بیٹھے رہے وہاں مولانا کے سامنے، بالکل مؤدب مریدوں کی طرح اور انہوں نے سگریٹ نہیں پی۔ سلیم احمد چین سموکر تھے۔ ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ یہ صبح اُٹھ کر بس

ایک ماچس کی تیلی جلاتے ہیں، اس کے بعد سگریٹ سے سگریٹ سُلگاتے ہیں۔ تو یہ تقریباً ناممکن تھا۔ ان کے بارے میں یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ یہ آدھا گھنٹہ بھی بیداری کی حالت میں سگریٹ کے بغیر رہ سکتے ہیں۔ لیکن وہاں بیچ میں اُٹھ کے بھی نہیں گئے اور باہر نکل کے میں نے پوچھا بھی کہ سلیم بھائی، آپ نے سگریٹ بھی نہیں پی؟ کہنے لگے، بھئی مولانا کے سامنے کیسے ہمت کر سکتا ہوں۔ اور مولانا کی خدمت میں جب بیٹھتا ہوں، تو سگریٹ وغیرہ پینا یاد بھی نہیں رہتا۔

اب میں ظاہر ہے کہ نویں دسویں کا طالب علم، میں مولانا کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکا۔ اور خیر نویں دسویں پہ کیا موقوف ہے اب بھی سن لوں تو شاید نہ سمجھ سکوں۔ لیکن وہ جو سچے علم میں ایک تاثیر جو ہوتی ہے۔ علم صرف قوتِ تفہیم کا نام نہیں ہے کہ جو آپ جانتے

ہیں وہ دوسرے کو سکھا دیں۔ علم مکمل ہو کر تفہیم کے درجے سے تجاوز کر کے تاثیر کی سطح اختیار کرتا ہے۔ یعنی وہ علم گویا منتقلی کے لیے مخاطَب کے ذہن پر انحصار کرنے کے بجائے، اس کے قلب اور اس کے وجود کو ری کنڈیشن کرتا چلا جاتا ہے اور ری کنڈیشنگ کے اس عمل میں اگر ذہن شامل ہو تو بہت خوب۔ لیکن اگر ذہن عاجز رہ جائے اس کلام کے فہم سے، تو بھی اس کلام کی تاثیر جو ہے وہ کسی نا کسی گہری سطح وجود اور کسی نا کسی زاویۂ شخصیت پر مرتب ضرور ہوتا ہے۔ ہمارے مولانا بلاشبہ علم کی اس انتہائی سطح پر جو پیغمبرانہ روایت کی اصل وارث ہے، اس پر انتہائی درجے کے ساتھ فائز تھے۔ ان کی بات جن کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی انہیں بھی بدل ضرور دیتی تھی۔ اس کا تجربہ مجھے ہمیشہ ہوا ہے ان کی گفتگو سنتے وقت۔

جب سلیم بھائی کے ساتھ، میں بھی نکلنے لگا اس وقت کمرے میں دو چار آدمی رہ گئے ہوں گے۔ نکلتے وقت، اجازت لیتے وقت مولانا نے سلیم بھائی کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اس لڑکے سے کہہ دو کہ میرے پاس آیا جایا کرے۔ اس میں یہ اشارہ بھی تھا کہ ضروری نہیں ہے کہ جب تم آؤ، تو یہ آئے۔ مطلب، اس طرح فرمایا کہ اسے کہو یہ آیا جایا کرے۔ پتہ نہیں کیا بات ہے مجھے پہلے ہی ان کی محبت بہت غلبے کے ساتھ محسوس ہو رہی تھی۔ یہ سن کر جیسے میرے اندر ایک گریے کی طغیانی سی پیدا ہوئی جس کو میں نے بہت مشکل سے روکا۔ مطلب، بہت رونے کو دل چاہنے لگا۔ اس کے دوسرے ہی دن میں مولانا کی خدمت میں پہنچا۔ مولانا کے لیے جیسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ تو مجھے کرنا ہی تھا، یہ تو ہونا ہی تھا۔ انہوں نے مجھے بالکل جیسے ایک آدمی برسوں سے ملتا چلا آ رہا ہے اس طرح سے مجھ سے

کہا، بیٹھ جاؤ۔ اور تھوڑی دیر بیٹھا تو مجھ سے کہا، تمہیں پان کی پہچان ہے۔ میں نے کہا کہ حضرت، مجھے تو نہیں ہے پان کی پہچان، تو ایک نقشہ ایک کاغذ پہ بنایا اور کہا۔ یہاں سے وہاں جاؤ، اس گلی میں جانا، اس گلی میں جو پان کی تین دکانیں ہیں ان میں جو بیچ کی دکان ہے، اس کا نام یہ ہے، اس سے جا کے یہ پان لے کر آؤ۔ یہ پہلی ڈائریکٹ ملاقات تھی تو مولانا نے مجھے پان لینے بھیجا۔ پان لینے کے لیے خاصی دور جانا پڑتا تھا۔ کھارادر ایک جگہ تھی وہاں پہ۔ اس کے بعد جب میں پان لایا، تو ایک جملہ فرمایا۔ تم کچھ سُست لگتے ہو۔ کہنے لگے، اچھا، اچھا، یہ ہے، وہ ہے، تم کہاں کے ہو، کیا کرتے ہو، کہاں رہتے ہو، سلیم احمد سے تمہارا کیا تعلق ہے۔ اس طرح کی کچھ عام سی باتیں تاکہ میں ان کے ذہن میں اپنی ٹوٹی پھوٹی شناخت کے ساتھ رہ جاؤں۔

اس طرح کے سوالات مجھ سے پوچھے۔ اور اب یہ لگتا ہے کہ جیسے دعا

کرنے کے لیے میرا وہ تعارف طلب فرمایا کہ میں دعا کروں۔ اس حد تک کا تعارف، زیادہ گہرائی میں نہیں۔

اس کے بعد سے پھر یہ ہو گیا کہ شاید ہی کوئی دن گزرتا ہو کہ مولانا کی خدمت میں میں حاضر نہ ہوتا ہوں۔ کچھ مہینے بعد، شاید دو مہینے گزرے ہوں گے، اس دوران مولانا کے سارے دروس میں جہاں بھی درس ہوتا تھا میں خادم کے طور پر ساتھ رہتا تھا۔ مطلب، شاید ہی کوئی درس ہوا ہو جس میں شریک نہ ہوا ہوں۔ شرکت کیا ہوتی تھی سننے والے جو شاگرد تھے وہ تو سامنے بیٹھتے تھے، میں مولانا کے پیچھے، جیسے وہ پنکھا جھلنا یا اس طرح کی کوئی خدمت کرنا، یا مولانا کا اگال دان ٹھیک کر دینا، اس طرح کی پیچھے پیچھے رہ کے جو خدمت ہوتی ہے وہ کرتا تھا۔ اور ظاہر ہے سمجھ سے باہر تھے وہ تمام موضوعات جس پہ مولانا کلام فرماتے تھے۔ لیکن بس دیکھ دیکھ کے یہ خوشی ہوتی تھی کہ

ہمارے مولانا کی شان دیکھو سب لوگ سر جھُکائے سُن رہے ہیں۔ مطلب مجھے یہ بس خوشی ہوتی تھی کہ مولانا کے آگے ہر آدمی جھُکا ہوا ہے۔

اور ہمارے مولانا درس میں ادب، آداب سلیقے اور ڈسپلن کے بہت قائل تھے اور جو ڈسپلن انہوں نے بنا رکھا تھا اس کی خلاف ورزی نہیں کرنے دیتے تھے۔ مطلب ضروری ہے کہ نظریں ایک جگہ پہ ہوں، کوئی گھڑی نہ دیکھے، کوئی اِدھر اُدھر نہ دیکھے، کوئی پہلو نہ بدلے، اس طرح کی ان کی طرف سے پابندیاں تھیں اور ان پابندیوں کی خلاف ورزی پر وہ خاصی توہین بھی کر دیتے تھے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ان پابندیوں کی خلاف ورزیوں کے مظاہر بہت شاذونادر ہی دیکھنے میں آیا کرتے تھے۔

خیر، دو تین مہینے بعد مجھے ایک یقین سا ہو گیا اور اس یقین کے پیدا ہو جانے نے مولانا کے ساتھ میرے تعلق کے اغراض اور مقاصد کو بدل کر رکھ دیا۔ یا یوں کہہ لیں کہ "مولانا رحمۃ اللہ علیہ" کے ساتھ تعلق کو معنی دے دیے۔ اس وقت تک وہ جو ایک بچگانہ قسم کی محبت تھی نا کہ بس مولانا سے محبت ہے مولانا کو دیکھے بغیر دل نہیں لگتا۔ اس طرح کے جذبات کے ساتھ۔ لیکن دو تین مہینے بعد جا کے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے دل میں یہ بات ڈالی کہ یہ تمہارے ہادی ہیں، یہ تمہارے مُربّی ہیں، ان سے محبت تمہاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم سے محبت ہے۔ ان سے محبت، اللہ سے محبت ہے۔ ان کی محبت سے محرومی، ان دونوں محبتوں سے محرومی کا یقینی سبب ہے۔ تو یہ جیسے مجھے شدت سے ساتھ تسلسل سے محسوس ہونا شروع ہوا، تو پھر میں نے مولانا سے ایک مرتبہ تنہائی میں ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں یہ

عرض کہ مجھے ایسا محسوس ہوا ہے۔ تو مولانا نے ذرا دیر کے لیے ایک آدھ سیکنڈ کے لیے مجھ پہ نظریں گاڑیں اور پھر ایک دم آنکھوں کا تاثر بدل کے کہنے لگے۔ ارے، یہ ہوتا رہتا ہے، بس تم یہ یاد رکھو کہ اللہ واسطے کا تعلق رکھنا چاہیے۔ ورنہ جو ایک سیکنڈ کے لیے نظر گاڑی تھی، وہ مجھے یقین ہے کہ وہ مرشدانہ نگاہ تھی۔ گویا انھوں نے اندر سے مجھے جھانکا کہ جو میں کہہ رہا ہوں یہ ٹھیک ہے۔ ان شاء اللہ، امید ہے کہ انھیں تصدیق ہوئی ہوگی کہ میں جذبے کی سطح پر بہر حال ٹھیک ہوں۔ تو انھوں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا مجھے اپنے دائرۂ فیض میں لینے کا۔ لیکن جیسا کہ ان کا مزاج تھا کہ کبھی اظہار نہیں ہونے دیتے تھے۔ ویسے ایک سیکنڈ میں، میرے خیال سے یہ انھوں فیصلہ کرلیا اور اس کے بعد بالکل ایسے گرا کے کہنے لگے۔ ارے، یہ سب ہوتا رہتا ہے، تم بس یہ کرو کہ اللہ واسطے کی محبت ہونی چاہیے۔ یعنی

ہماری محبت اللہ کے لیے ہونی چاہیے۔ اس کے بعد کوئی اور باتیں شروع کردِیں۔ بس اس نگاہ کے بعد سے اور پھر چونکہ مجھے اللہ کے فضل سے، اللہ کی مہربانی سے مولانا کی خلوت میں مولانا کے اکثر لوگوں کے مقابلے میں زیادہ رسائی حاصل تھی۔ جیسے مولانا کا پان لینے گئے ہیں اب آئے ہیں تو اکیلے ہیں مولانا کو پان دے دیا۔ اس وقت مولانا نے بٹھا کے کوئی بات بتائی، کوئی چیز بتائی، یا کوئی ڈانٹ سنائی، یا کوئی اور کام بتایا، تو اس طرح میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے الحمدللہ مولانا کی خلوت میں رسائی کے مواقع بہت ملے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ مولانا ایسی خلوت میں جہاں وہ کسی کے آنے کی توقع نہیں کر رہے ہوتے تھے اس مکمل خلوت میں مولانا کی مصروفیت کیا ہوتی تھی۔ میں نے یہ بھی الحمدللہ دیکھا۔ جب اس طرح کے دو چار مشاہدات

مجھے ہوئے مولانا کے ساتھ، کہہ سکتے ہیں کہ تقریباً ہر حال میں ان کو دیکھا ہو گا۔

اس کے بعد مجھے ایک چیز جیسے یقین کے ساتھ سوجھ گئی اور جس میں آج بھی روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے کہ مولانا اکثر اخلاقی اور علمی فضائل میں میرے علم میں موجود تمام بزرگوں اور عالموں سے آگے تھے۔ ہمارا دین ہم سے جو اوصاف طلب کرتا ہے دین داری کے لیے بھی اور ایک معاشرتی وجود کی حیثیت سے بھی، یعنی ہمارا دین ہمیں دو پوزیشنز پر مستقلاً رکھنا چاہتا ہے۔ ایک بندۂ خدا کی پوزیشن ہے اور ایک معاشرتی وجود کی حیثیت ہے۔ تو بندۂ خدا کی حیثیت سے بھی، میں نے عبادت گزاری کے ایسے مُحیر العقول مظاہر نہیں دیکھے جو مولانا کے ہاں معمول تھے۔ اور معاشرتی وجود کی حیثیت سے بھی، میں نے مولانا جیسا حُسنِ معاشرت کے قیام میں مسلسل طور پر فکر مند

اور کوشش کرنے والا کوئی اور نہیں دیکھا۔ مطلب، وہ تنہائی میں جیسے جذب ہو جاتے تھے اپنی عبادات میں اور ان کی جلوت کا بیشتر حصہ ان چیزوں میں گزرتا تھا کہ فلاں کی شادی ہے، فلاں کے ہاں کھانا نہیں ہے، فلاں کو گھر دلوانا ہے، فلاں کو کاروبار کروانا ہے، فلاں کو پیسے بھجوانے ہیں۔ مطلب، ان کی جلوت زیادہ تر ان چیزوں میں گزرتی تھی۔ اور وہ بالکل غریبوں کے محلے میں رہتے تھے۔ اسی گز کا ان کا کوارٹر تھا جس میں وہ پینتالیس پچاس برس رہ کر فوت ہوئے۔ اور کراچی کے دولت مند ترین لوگ ان کے نوکر اور معتقد تھے لیکن اس کے باوجود زندگی انہوں نے اَسی گز کے کوارٹر میں گزاری ہے. جس میں ڈیڑھ کمرے تھے۔

خیر، یہ جب مجھے یقین ہو گیا اللہ کے فضل سے اور یہ یقین ایسا نہیں تھا کہ کسی جذباتی لمحے میں پیدا ہوا ہو۔ یہ یقین الحمدللہ ایسا تھا کہ آج بھی

اتنا وقت گزر گیا ہے مولانا کے انتقال کو، کوئی چوالیس بَرَس ہو چکے ہیں، چوالیس برس کا ہر دن مولانا کے سلسلے میں اس یقین کو بڑھانے ہی کا ذریعہ ثابت ہوا ہے کہ مولانا جیسا بندۂ خدا نہ میں نے دیکھا ہے، نہ دیکھنے کی امید ہے۔ مولانا جیسا عظیم انسان، غریب نواز آدمی، نہ میں نے پہلے دیکھا ہے، نہ دیکھنے کی امید ہے۔ بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ آدمی بہترین ذہنی صلاحیت کے ساتھ بندگی کے جو اوصاف تلاش کرنے پر قادر ہے مولانا ان اوصاف کو زیادہ مکمل حالت میں اپنے اندر (contain) کیے ہوئے تھے۔ اور آدمی اپنے ذہن کی بہترین صلاحیت کے ساتھ ایک اچھے اور کامل معاشرتی وجود کی جن (definitions) تعریفات تک جن (concepts) تصورات تک پہنچ سکتا ہے مولانا اپنی ذات میں اپنے عمل سے ان

تمام (concepts) تصورات سے زیادہ مکمل تھے۔ تو یہ جو شان میں نے دیکھی، مطلب آج بھی اگر میری کسی بات سے تسکین اور رہنمائی ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ یعنی آدمی کے اندر رہنمائی پانے کا سب سے موثر چینل یہ ہے کہ اس کا رہنمائی حاصل کرنا حالتِ تسکین اور حالِ یقین کے ساتھ ہو۔ وہ الحمدللہ اپنے دیکھے ہوئے بزرگوں میں صرف مولانا کو یاد کر لینے سے میسر آجاتی ہے۔ میں نے الحمدللہ، بہت بڑے بڑے لوگوں کو دیکھا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی مولانا کے ایسی شان نہیں رکھتا کہ آج بھی مولانا یاد آتے ہیں، تو رہنمائی کا ایک نظام چل پڑتا ہے۔ اور اس رہنمائی سے جڑی ہوئی تسکین اور یقین میں بھی جیسے اس کے مناسبِ حال، اس رہنمائی سے ہم قدمی پیدا کر لینے والی تسکین بھی حاصل ہوتی رہتی ہے۔

کوئی وجہ ہوگی ناں کہ مولانا سے تعلق رکھنے والے والا تقریباً ہر آدمی مولانا سے تعلقِ محبت رکھنے والا تقریباً ہر آدمی، اپنے تمام تعلقات اپنے تمام رشتوں کے مقابلے میں مولانا کو آج بھی زیادہ محبوب رکھتا ہے۔ آج بھی مولانا کی مجلسوں میں حاضری دینے والے کچھ لوگ موجود ہیں اور میں اپنے تجربے سے، ان کی باتیں سن کر یہ جانتا ہوں کہ وہ کسی بھی رشتے اور کسی بھی دوستی کو مولانا کے ساتھ تعلق کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں دیتے۔ میں اپنا حال بتا سکتا ہوں کہ جس شخص کو کھوئے ہوئے چوالیس برس ہو گئے ہوں، جس شخص کو پایا بھی تھا تو بے شعوری کی حالت میں پایا تھا۔ لیکن یہ کہ میں یہ بات قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ مولانا اس وقت بھی مجھے اپنے ماں باپ، اپنی اولاد، اپنے تمام رشتوں، اپنی دوستی کی تمام قسموں سے زیادہ محبوب ہیں۔ اور اس محبت کی اُٹھان میں کبھی کوئی کمی نہیں آئی۔ بلکہ یوں کہہ

لیں کہ اس محبت کی خدا واسطے کی جو افادیت ہے، افادیت رسانی کی اس رفتار میں بھی کبھی کوئی کمی نہیں آئی۔ جہاں جہاں ان کا خیال آتا ہے وہیں کوئی ذہنی یا اخلاقی خرابی دور ہو جاتی ہے، کوئی بنیادی نقص تمام ہو جاتا ہے، کسی طرح کا باطنی خلا ہوتا ہے جو ان کی یاد آنے سے بھر جاتا ہے۔ ان کی یاد میں یہ تاثیر ہے تو آپ سمجھ لیں کہ جب وہ سامنے ہوں گے تو ان کی اثر اندازی کا کیا عالم ہو گا۔

اس بات کو سمیٹتے ہوئے بس یہ عرض کر رہا ہوں کہ جس نے مولانا کو نہیں دیکھا، وہ مولانا جیسا دیکھنے کی امید رکھنے کا بھی حق نہیں رکھتا۔ جس نے مولانا کو نہیں دیکھا، اب کوئی مولانا کو دیکھنے کی امید رکھے گا، تو گویا ایک جھوٹی خواہش پالنے کا ارتکاب کرے گا۔ یہ میرا اپنے بس بھر یقین ہے۔ درویشی ہو، ایک خاص معنی میں اخلاقی سلطانی ہو، اللہ کے آگے فنا ہو جانے کا حال ہو، مخلوق کے لیے خود کو مٹا لینے کا جذبہ

ہو، کسی بھی پہلو سے دیکھیں، کسی کرداری اور اخلاقی پہلو سے دیکھیں، تو مولانا سے برابری کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ مطلب، مجھے ان لوگوں میں نظر نہیں آتا جن لوگوں کو ہم نے اپنی چشمِ سر سے دیکھا ہے۔ اور ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ ہم اپنے بہت پرانے اسلاف کے طبقے کی کسی شخصیت سے ملنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا تھا۔ کبھی لگتا تھا، امام غزالی سے مل رہا ہوں۔ کبھی لگتا تھا، امام رازی سے مل رہا ہوں۔ کبھی لگتا ہے فلاں سے، بڑے بڑے نام آتے تھے ذہن میں کہ ان سے مل رہا ہوں مولانا کے روپ میں۔ آج بھی اس بات کا یقین ہے کہ مولانا سے ملنے والے کو اگر غزالی سے ملاقات کا شرف نہیں ملا، تو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ مولانا کی خدمت میں حاضر رہنے والے کو اگر امام رازی سے

مصاحبت کا شرف حاصل نہیں ہوا، تو کوئی نقصان نہیں ہوا، یہ تھے ہمارے مولانا۔

(جہاں تک) ان کی غریبوں سے محبت (کا تعلق ہے)، یہ بات بالکل ایک دینی اصول کے طور پر اپنی گرہ میں باندھ لینی چاہیے کہ جس کو غریبوں سے محبت نہیں ہے، جسے مسکینوں سے اُلفت نہیں ہے، وہ اس دین کے جوہرِ محبت سے محروم ہے۔ دین میں ایک جوہرِ محبت ہے، ایک جوہرِ معرفت ہے، ایک جوہرِ خشیت ہے۔ یہ تین جوہر حاصل ہو جائیں، تو دین میں اپنی تکمیل کا موقع توفیقِ الٰہیہ سے حاصل ہو جاتا ہے۔ تو جس شخص کو مسکینوں سے محبت نہیں ہے، جو شخص اپنے بڑوں کا ادب نہیں کرتا، جو شخص اپنے چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتا، اُس کے اندر اِس دین کے خزانے کے قلب میں رکھا ہوا جوہرِ محبت منتقل نہیں ہوتا۔ وہ اس دین کے معیارِ محبت پر پورا نہیں

اتر سکتا، یعنی وہ اللہ کی محبت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی محبت کا امید وار بھی نہیں بن سکتا اگر اسے غریبوں سے سچی، بے تاب اور بے قرار رکھنے والی محبت نہیں ہے، فکرمند رکھنے والی محبت نہیں ہے، آمادۂ عمل رکھنے والی محبت نہیں ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شکل میں اس ہستی کو دیکھا اور مسلسل دیکھا۔ اور انہیں دیکھ کر گویا یہ مشاہدے میں آیا، یہ سمجھ میں آیا کہ مسکینوں سے محبت کسے کہتے ہیں۔ غریبوں سے الفت کس چیز کا نام ہے۔ مطلب، یہ قصے میں سنانا شروع کر دوں کہ وہ مسکینوں سے، غریبوں سے، ضرورت مندوں سے کیسی محبت کرتے تھے، تو صرف دو سال بلکہ ایک مہینہ کَم دو سال کے تعلق کے مشاہدات کا بیان کئی گھنٹوں میں ہو گا۔ یعنی میرا حضرت سے تعلق صرف تئیس (23) مہینے کا ہے۔ اس انتہائی قلیل مدت میں ایک انتہائی

بے شعور آدمی کے مشاہدات میں بھی مولانا کے حُبُ المساکین ہونے کے ایسے ایسے مظاہر میرے سامنے آئے ہیں، اتنی کثرت سے اس کے مظاہر کا مشاہدہ کیا ہے کہ اگر انھیں صرف رپورٹ کرنے لگوں تو گھنٹے لگ جائیں گے۔ یہ ان کا حال تھا۔ مطلب، ان کی گلی میں رہنے والوں نے شاید کراچی کے بہترین کھانے روز کھائے ہوں گے، یا اکثر کھائے ہوں گے ان کی بدولت۔ اور کتنے بے گھروں کو انھوں نے مکان دیا۔ کتنے بے سہاروں کا وہ مستقل سہارا بنے۔ کتنے ہاتھ پھیلانے والوں کو انھوں نے دوسروں کی مدد کے قابل بنایا۔ یہ میرے مشاہدے میں ہے۔ کس کس طرح وہ امیر لوگوں کو، اپنے حلقے کے امیر معتقدین کو مسلسل مصروف رکھتے تھے دوسروں کی مدد میں۔

ان کا ایک عجیب رویہ تھا جو میں عرض کر دوں۔ کسی ضرورت مند کے لیے اگر وہ کسی امیر آدمی سے کہہ دیں کہ اس کو دس ہزار دے دو۔ اب سَن ستر اُنہتر (70/69ء) میں دس ہزار کی رقم بہت زیادہ تھی۔ وہ ایسے ہی کہتے تھے جیسے دس کنکر دے دو۔ یا ان کے لہجے میں ایسے ہی ہوتا تھا، اس کو دس ہزار روپے دے دو۔ اگر وہ تھوڑی دیر کے لیے چونک گیا، دس ہزار کی رقم ہی ایسی تھی کہ آدمی چونک جاتا، چونک کر اس نے پوچھا۔ مولانا، کیا ارشاد فرمایا؟ کتنے دے دوں؟ تو کہتے تھے، پندرہ ہزار دے دو۔ یہ سب کہتے ہوئے لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ دس ہزار اتنی بڑی رقم ہے، پندرہ ہزار اتنی بڑی رقم ہے، بالکل نہیں۔ وہ میرا خیال ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے گراوٹ کا ایک عنصر رکھا ہوا ہے۔ مولانا اس عنصر کو گویا اپنی گرفت میں پوری طرح لے چکے تھے۔ ان کے یہاں دنیا کا ہونا، نہ ہونا،

چیزوں کا ہونا، یا نہ ہونا، بالکل برابر تھا۔ وہ دیکھتے ہوئے بھی دنیا کو نہیں دیکھتے تھے۔ اس طرح کی ان کی مسکین نوازی تھی۔

ایک اور واقعہ عرض کردوں کہ اس سے بھی جیسے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور یہ واقعہ ایسا ہے کہ جو میری آپ کی زندگی کا رُخ بدل سکتا ہے۔ ایک یتیم بچی کی شادی مولانا نے کروائی، پورا ذمہ لے کر۔ شادی میں یہ ہوتا تھا کہ چیزیں بھی ساری گھر گرہستی کی، ایک کوارٹر بھی، اسی گز کا ایک گھر بھی، یہ سب چیزیں ہوتی تھی۔ اور چونکہ ان کے خدام بہت امیر تھے، بہت کثرت سے امراء تھے، تو وہ کسی ایک ہی کو اس طرح کی شادی کی ذمہ داری دے دیتے تھے۔ اس بچی کی شادی کی ذمہ داری مولانا نے ایک انتہائی قدیم حاضر باش فضل صاحب کو دی جو ٹیکسٹائل مل اونر تھے، صنعت کار تھے۔ چنیوٹ کے تھے۔ جب وہ شادی ہو رہی تھی، اس زمانے میں ان کا رواج

تھا، گلیوں میں ٹینٹ وغیرہ لگواتے تھے۔ اچھی دھوم دھام سے شادی کروائی۔ اس کے بعد انہوں نے فضل صاحب سے میری موجودگی میں یہ کہا کہ یہ سامنے قرآن شریف رکھا ہے اسے اٹھاؤ اور اس پہ ہاتھ رکھ کے کہو کہ اپنی بیٹی کی بھی شادی اسی طرح کرو گے۔ اگر تمہاری اپنی بیٹی ہوتی، تو بھی تم یہی کرتے۔ اب آپ مولانا کی شانِ تربیت دیکھیں، مولانا کا اپنے خادموں پر تصرف دیکھیں۔ انہوں نے قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کے کہہ دیا۔ جی، مولانا، میری بیٹی بھی بے شک ہوتی، تو ایسے ہی کرتا شادی۔ پھر مولانا نے کہا، ٹھیک ہے۔ یہ تھا ان کی انسان دوستی کا پہلو، غریبوں سے محبت کا پہلو۔

اسی طرح، اس رَو میں بہتے ہوئے، میں ایک اور وصف کی طرف اشارہ کرتا ہوں جو نادر اور نایاب وصف ہے اہلِ علم میں آج کل۔ لیکن ہمارے اسلاف کی اکثریت گویا اس وصف سے بھری ہوئی

تھی۔ وہ وصف تھا معصومیت۔ مولانا ہمارے بہت معصومیت (والے تھے)۔ فراست کی یہ انتہا تھی کہ انھیں کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اور معصومیت کا یہ حال تھا کہ انہوں نے آدم جی گروپ کے چیئرمین سے کہہ دیا کہ لالوکھیت میں کوئی مچھلی کی دکان کھلوادو۔

مطلب، اتنے بھولے آدمی تھے۔ اور دنیاوی معاملات میں اُن کے رہنے کا انداز بھولے آدمیوں جیسا تھا یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ نے جنتیوں کے لیے جو انداز مقرر فرما رکھا ہے، مولانا جنت میں رہنے والوں کے اُس حال کے ساتھ دنیا میں رہتے تھے یعنی بھول پن کے ساتھ۔

اپنے چھوٹوں کی تربیت میں ذمہ داری کو غالب رکھتے تھے، جذبات پر۔ اِس وجہ سے سخت تھے۔ اُن کو کہا جاتا تھا، مطلب، ہم لوگ آپس میں جب باہر بات کرتے تھے، تو کہتے تھے کہ مولانا اور چیزوں کے

امام تو ہیں ہی، توہین کرنے کی امامت بھی انھیں حاصل ہے۔ بہت مفصل اور مدلل ڈانٹ ہوتی تھی ان کی۔ وہ تنہائی میں نہیں ہوتی تھی، لوگوں کے سامنے ہوتی تھی۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ جس چیز پہ وہ ڈانٹ پڑتی تھی، وہ چیز جیسے خود بخود نفس میں سے خارج ہو جایا کرتی تھی۔ چند اوصاف ایسے ہیں جو مولانا سے اس طرح کا تعلق رکھنے والے تمام لوگوں میں مشترک ہیں۔ اور اس کا واحد سبب، مولانا سے ڈانٹ کھانا ہی ہے۔ جیسے اُن کا کوئی بھی متعلق، ریا سے پاک ملے گا، حُبِ دنیا سے پاک ملے گا، بے غرض ملے گا، غریبوں سے محبت کرنے والا ملے گا۔ اگر کچھ عبادات اور ذکر اذکار کرتا ہے، تو اس کو چھپانے کی کوشش کرنے والا ملے گا۔ اور مولانا کا انتہائے عشق کے ساتھ تذکرہ کرنے والا ملے گا۔ یہ مشترک اوصاف ہیں مولانا کے متعلقین میں۔

مولانا کو دیکھنے کا ایک اینگل /زاویہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر ہم یہ (realize) کرلیں (سمجھ جائیں) کہ ہمارے دین کے دو بڑے بڑے مقاصد ہیں اوران مقاصد کو حاصل کیے بغیر، حاصل رکھے بغیر، اس دین کے ساتھ وابستگی کے ابتدائی تقاضے بھی پورے نہیں ہوسکتے۔ وہ دو چیزیں ہیں، ذوق عبادت اور حسنِ معاشرت۔ گویا ہم کسی شخص کے دینی درجے، دینی اہمیت اور دینی وقعت کا اندازہ ان دو معیارات کو اُس پر اپلائی (اطلاق) کر کے بھی کرسکتے ہیں کہ اِس شخص میں ذوقِ عبادت کس درجہ کا ہے اوراِس شخص میں حسنِ معاشرت میں ایک فعال کارکن کی طرح رہنے کی قوت، صلاحیت اور عمل کس درجہ کا ہے۔ آپ سمجھیں کہ یہ انبیائے علیھم السلام کا مزاج مشترک ہے کہ تنہائی میں اللہ کی طرف سجدے کی حالت میں

یکسو، جلوت میں مخلوق کے فائدے کی جدوجہد۔ وہ فائدہ دنیاوی بھی ہے، اخروی بھی ہے۔ یعنی نبی مزاجاً معاشرے بنانے والا اور تنہائی کا ادب سکھانے والا ہوتا ہے۔ اِس پہلو سے بھی دیکھیں مولانا کو، تو مولانا دنگ کر دینے والے کمالات رکھتے ہیں۔

مثال کے طور پر، میں نے آخری جوان کی زندگی کے، حیاتِ اقدس کے دو مہینے تھے جس میں وہ شدید بیمار تھے اور مجموعۂ امراض ہو کر رہ گئے تھے، اُس حالت میں، میں نے آخری دو مہینے خادم کے طور پہ وہاں گزارے اُن کے گھر میں تاکہ کوئی ضرورت ہو۔ وضو خود سے نہیں کر سکتے تھے، وضو میں کرواتا تھا۔ اُن دو مہینوں میں، میں نے ان کی ایک تہجد چھوٹتے نہیں دیکھی۔ ہمیشہ فجر کی اذان سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے، سوا گھنٹہ پہلے، وہ کوشش کرتے تھے کہ وہ مصلے پر ہوں۔ اور تہجد ایسی پڑھتے تھے جیسی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل

مبارکہ میں روایت کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ اقدس سے گویا ہنڈیا کھولنے کی آواز آتی تھی۔ میں نے ہنڈیا کھولنے کی یہ آواز تقریباً روز، مولانا کے سینے سے نکلتے، تہجد کے وقت، سنی ہے۔ میں نے مولانا کی تہجد دیکھی ہے اور اُس دیکھنے کا یہ فیض ہے کہ مجھ پر یہ روشن ہو گیا کہ تہجد کی مسنون ہیئت اور صورت اور حالت کیا ہوتی ہے۔ یعنی مولانا کی نماز سے، نماز کی مسنون صورت جو (convey) ہو گئی، وہ اور لوگوں کی نماز سے بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن مولانا کی نماز سے، نماز کی مسنون حالت، مجھ پر منکشف ہو جائے، یہ میں نے صرف مولانا کو، یا اس طرح کے دو ایک اور حضرات کو دیکھا ہے کہ جنھیں دیکھنے سے آدمی نماز کی روح یعنی حالتِ احسان کو نماز کے باہر رہتے ہوئے صرف ان کی نماز دیکھ کر

محسوس کرلے۔ میں نے ہمیشہ مولانا کو نماز پڑھتے دیکھ کر، ہمیشہ کیفیتِ احسان کو ایک ٹھوس حالت کے طور پر اپنے اندر کارفرما دیکھ لیا۔ یہ ذوقِ عبادت کی حد اور انتہا ہے۔

مولانا جس مصلے پر نماز پڑھتے تھے، وہ مصلہ کیا تھا؟ ٹاٹ کا ایک ٹکڑا تھا۔ اُس پہ مولانا کے استاد کی جائے نماز جو وقت گزرنے کی وجہ سے پھٹ گئی تھی، گل گئی تھی، اُس کے ٹکڑے جو ہیں وہ ٹاٹ کے اُس ٹکڑے پر سلے ہوئے تھے۔ یہ مولانا کا مصلۂ تہجد تھا یعنی مصلۂ نوافل تھا۔ میں روز مولانا کے جائے نماز کو سُکھاتا تھا۔ دسمبر اور جنوری کے مہینے تھے۔ کبھی اُن کی نماز ایسی نہیں ہوئی کہ اس کے بعد ان کے مصلے میں سجدہ گاہ کی جگہ کو سُکھانے کی نوبت نہ آئی ہو۔ اِتنا گریہ کرتے تھے وہ نمازمیں۔ اور پھر آپ دیکھیں کہ ایک شخص اپنے مرض الموت میں ہے، نیم معذوری میں ہے۔ وہ روز گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے

اذان سے، مصلے پر ہوتا ہے۔ اور اشراق کا سلام پھیر کر آواز دیتا ہے کہ اب مجھے اٹھاؤ۔ یہ روز کا معمول ہے ان کے آخری دو مہینے کا۔

اُن کے ذوقِ عبادت کا تو یہ حال تھا۔ اور اُس میں اخفاء اتنا تھا کہ ایک آدھ مرتبہ وہ سلام پھیر کے مجھے دیکھ لیا کہ میں کھڑکی سے انھیں دیکھ رہا ہوں، تو بہت سختی سے ڈانٹا۔ کہا کہ لوگوں میں قصہ کہانیاں نہ کہتے پھرنا۔ مطلب، اس طرح کا اُن کا وہ (اخفاء) تھا۔ تراویح جو ہیں وہ گھر پہ پڑھتے تھے۔ مسجد میں نہیں پڑھتے تھے۔ اپنے لیے افضل سمجھتے تھے کہ میں گھر پہ پڑھوں۔ اور حفظ اُن کا اتنا پختہ تھا کہ شاید عالمِ اسلام میں دو آدمیوں کا بھی اتنا پختہ حفظ نکل آئے، تو اچنبھے کی بات ہوگی۔ حفظ اس طرح کا تھا کہ ابھی وہ تیرھویں سپارے پہ ہیں، پھر وہاں سے ایک آیت سے اٹھ کر ایک دم سے اٹھائیسویں سپارے پر چلے

گئے۔ پھر اُس کے ہم مضمون آیت کے لیے پانچویں سپارے میں آ گئے۔ اس طرح تین چار سپاروں میں اُس مضمون کی وحدت بنائی اور پھر جہاں سے چھوڑا تھا وہاں سے پھر ترتیب سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اور اُن کو لقمہ دیتے ہوئے، ان کے جو ایک قدیم ترین دوست اور استاد بھائی مولانا عبد الجبار صاحب تھے، وہ کہتے ہیں کہ مولانا کو لقمہ پڑھتے ہوئے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ مطلب، غلطی نہیں کرتے تھے پڑھنے میں۔ تو وہ تراویح ہوتی تھی سحری تک۔ مطلب، وہ تراویح کوئی تین گھنٹے چار گھنٹے کی تراویح ہوتی تھی۔ اُس میں یہ تھا کہ مولانا منع نہیں فرماتے تھے اگر کوئی شخص آ کے پیچھے کھڑا ہو جائے۔ لیکن جو اشخاص پیچھے آ کے پیچھے کھڑے ہوا کرتے تھے شوق میں، اُن میں سے دوبارہ آنے والے کم ہی ہوا کرتے تھے۔ اتنی لمبی تراویح۔ اور میں نے مولانا کو تنہا پڑھاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ میں تو پڑھتا نہیں

تھا۔ میں پڑھ کے ہی پہنچتا تھا وہاں پہ لیکن اس شوق میں کہ مولانا کو دیکھ لوں، تو میں یہ دیکھتا تھا کہ اکثر مولانا تنہا تراویح پڑھتے تھے آواز کے ساتھ۔ اور اِس کو اپنے لیے افضل سمجھتے تھے۔

بہر حال، یہ ان کا ذوقِ عبادت تھا۔ کبھی ممکن نہیں ہے کہ چار پانچ دن سے زیادہ لگ جائے ختمِ قرآن میں۔ کبھی ممکن نہیں ہے کہ اتنا زبردست حافظ ہوتے ہوئے، وہ ناظرہ تلاوت نہ کریں دو تین سپاروں کی۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ اور ان کا جو قرآن شریف تھا وہ بھی ان کے استاد کا ہدیہ تھا۔ آنسوؤں سے اس میں بلبلے پڑے ہوئے تھے۔ بلبلے سے بن گئے تھے کاغذ پر۔ اِتنا وہ گریہ کرتے تھے تنہائی میں۔ لیکن جلوت میں آتے تھے تو تسبیح رکھ دی۔ تسبیح بالکل نہیں رکھتے تھے۔ سنت (نماز) مسجد میں نہیں پڑھتے تھے، جو محلے کی مسجد ہے۔ اور امام سلام پھیر تا تھا تو فوراً جمپ لگا کے باہر آتے تھے۔

اس کے پیچھے دعا نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح نہ تسبیح، نہ کوئی اظہار، نہ کوئی دکھاوا، کچھ بھی نہیں۔ مطلب، انھیں اگر کوئی دن میں دیکھ لیتا تھا، تو عجیب سا احساس ہوتا تھا جیسے یہ کوئی تاجر آدمی ہے، کوئی دکان والے ہیں، اور تبلیغی جماعت وغیرہ کے زیرِ اثر داڑھی رکھ لی ہے۔ مطلب، کوئی اظہار، کوئی مظاہرہ نہیں۔ ایک ایسی بات میں بتانے جا رہا ہوں کہ اگر یہ ہمارے مذہبی طبقے، ہمارے دین دار لوگوں یا دین داری چاہنے والوں میں پیدا ہو جائے، تو سمجھو کہ ان کی بندگی کا جوہر انھیں نصیب ہو جائے گا۔ بندگی کا جوہر ہے بے نفسی اور عاجزی۔ ہمارے مولانا بہت بلند آواز تھے۔ ایسی آواز کہ لگتا تھا دس آدمیوں کی آواز مل کے ان کی آواز بنی ہے۔ بہت بھاری آواز تھی۔ وہ سرگوشی بھی کرتے تھے تو بہت دور تک آواز جاتی تھی۔ اِس آواز کے ساتھ وہ اپنے چوک پہ پان والے لڑکے سے لڑ رہے تھے،

باقاعدہ برابری سے ۔ اور لڑتے ہوئے اُس سے کہا کہ تیرے باپ کو بھی پان بنانا نہیں آتا، تجھے کیا آتا ہوگا ۔ اب اس کا باپ فوت ہو چکا ہے ۔ اُس کو غصہ آگیا ۔ اس نے کہا کہ آپ کے باپ کو کیا آتا تھا ۔ جب وہ یہ کہہ رہا تھا، تو مولانا کی آنکھوں میں ایک خوشی کی کیفیت تھی کہ الحمدللہ، وہ سُن لیا جو سننا چاہتا تھا ۔ توہین کرتے وہ احساسِ ذمہ داری کے ساتھ تھے، توہین کرواتے وہ احساسِ بندگی کے ساتھ ۔ مطلب، یہ ملامتی ہونا اپنے درست ترین مفہوم میں ۔ یہ ہے جو ہمارے مولانا تھے ۔

اسی طرح ایک صاحب تھے وہ دیواروں کی رنگائی کا کام کرتے تھے ۔ وہ مولانا کو اچھے بہت لگتے تھے ۔ مولانا، ان کی غیر موجودگی میں، ان کی تعریف کرتے تھے ۔ اور بالکل پڑھے لکھے نہیں تھے ۔ مولانا نے اُن کو کوئی وقت دیا ہوگا ۔ مولانا وقت کے بہت پابند تھے ۔ اگر آپ

کو پانچ بج کے پانچ منٹ کا وقت دیا ہے، تو خود انھیں آنا ہوگا تو پانچ بج کے چھ منٹ نہیں ہوں گے۔ عین پانچ بج کے پانچ منٹ پہ آپ کی گھنٹی بجائیں گے۔ اور وہ گلی میں ٹہلتے رہتے تھے کہ وقت پورا ہو تو میں گھنٹی بجاؤں۔ اسی طرح آپ کو آنا ہے، تو آپ کو بھی پانچ بج کے سات منٹ پہ آنا (allow) نہیں کریں گے۔ کہہ دیں گے کہ چلے جاؤ، وقت ہو گیا۔ مطلب، وقت کے انتہائی پابند تھے۔ انھیں (مذکورہ شخص) کو آنے میں کچھ دیر ہو گئی، تو مولانا نے ڈانٹنا شروع کر دیا کہ کیا ہو گیا تھا، اتنی دیر کہاں لگا دی۔ وہ کہنے لگے کہ جناب، یہ ہو گیا، بس خراب ہو گئی یا پتہ نہیں رکشا، مجھے یاد نہیں۔ لیکن ایسا عذر بتایا۔ مولانا نے کہا کہ تمہاری عمر کتنی ہے۔ کہنے لگے کہ میری عمر اڑتیس (38) سال ہے۔ (مولانا) کہنے لگے کہ میری عمر ستر (70)

سال کی ہے، مجھے تو ایسے عذر پیش نہیں آئے۔ تمہیں ہر روز اس طرح کا کوئی عذر پیش آجاتا ہے۔ تو اس پہ اس آدمی نے گھبرا کے کہا۔ مولانا، یہ تو آپ کی کرامت ہے، ہم تو گناہ گار لوگ ہیں۔ مولانا ڈانٹنے کے لیے اسے منھ کھول رہے تھے کہ مولانا کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مولانا بالکل لاجواب ہو گئے۔ پھر اسے کہا کہ اچھا اچھا، چل یوں کر، جاؤ۔ باہر نکل کے، جو لوگ مولانا سے ڈانٹ کھاتے رہتے تھے، انھوں نے اس کو بہت شاباش دی کہ آج تو نے مولانا کو لاجواب کر دیا ہے۔ یہ مولانا کا بھول پن تھا۔

میں عرض کر رہا تھا ذوقِ عبادت اور حسن معاشرت کے عنوان سے۔ ذوقِ عبادت کا پتہ، تنہائی میں چلتا ہے۔ وہ الحمدللہ، ہم نے تھوڑا بہت جھانک کے دیکھا ہے۔ اگر یہ لفظ استعمال کرنے کی اجازت ہو، مسنون تنہائی، اور کوئی پوچھے کہ تم نے مسنون تنہائی

دیکھی ہے، تو میں قسم کھا کے کہوں گا کہ ہاں، دیکھی ہے۔ میں نے مولانا کی تنہائی دیکھی ہے اور میں نے یقیناً مسنون تنہائی دیکھی ہے۔ اسی طرح کوئی پوچھے کہ تم نے مسنون جلوت دیکھی ہے، تو میں کہوں گا کہ یقیناً دیکھی ہے۔ میں نے مولانا کی جلوت دیکھ رکھی ہے۔

جیسے کوئی سوسائٹی، انسانی اجتماعیت کی تشکیل اخلاقی جوہر پہ ہو ہی نہیں سکتی جب تک اس میں امیری کو موجبِ فضیلت اور غریبی کو سببِ ذلت جاننے کا رویہ ختم نہیں ہوگا۔ جو سوسائٹی اپنے نظامِ مراتب میں امیری کو باعثِ عزت اور غریبی کو سببِ ذلت نہ بنائے، وہ سوسائٹی اعلیٰ درجے کا حسنِ معاشرت حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن جس سوسائٹی میں طبقاتی تقسیم مالداری اور عُسرت کے تضاد اور تقابل میں ہو، وہ سوسائٹی انسانوں کی سوسائٹی نہیں ہے، مسلمانوں یا دین داروں کا معاشرہ ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔

ہمارے مولانا اس انتہائی نکتے کو اپنے عمل سے دوسروں کو سمجھا دیتے تھے۔ یعنی مولانا کے لیے ناپسندیدہ شخصیت قرار پانے کا آسان ترین طریقہ یہ تھا کہ آپ امیر بن جائیں۔ امیر ہوتے ہی آپ مولانا کے لیے ناپسندیدہ شخصیت بن گئے۔ اور اِسی طرح مولانا کے دل کے دروازے پر دستک دینے کا آسان ترین راستہ یہ تھا کہ آپ غریب ہوجائیں۔ غریبوں کے لیے ان کے دل کا دروازہ کھُلا، امیروں کے لیے ان کے گھر کا دروازہ بند۔ اور کہتے بھی تھے کہ جو امیر ہے وہ مسلمان کہاں کا ہے۔ اتنی غربت پھیلی ہوئی ہے، اس کی موجودگی میں کوئی امیر ہو سکتا ہے۔ بہت زیادہ، اس معاملے میں بہت شدت تھی ان کے مزاج میں۔ بس امیر کوئی آدمی مل گیا، تو اس سے انھوں نے کوئی نہ کوئی قصہ شروع کر دیا۔ اس کی توہین کرنا۔ اس کو کہنا، او، پیچھے بیٹھو۔ یہ کیا جانوروں کی طرح بیٹھے ہو۔ مطلب، وہ

بہانے ڈھونڈتے تھے۔ اور اسی طرح ان لوگوں کی حقارت کر کر کے یعنی امیری کو نشانۂ حقارت بنا بنا کر، انھوں نے امیر طبقے کے دل میں حب مساکین پیدا کر کے دکھایا۔ اور ایسے ایسے بڑے بڑے ایثار مولانا کے خادموں نے کیے کہ جو آج شاید سوچے بھی نہ جا سکیں۔ ان معنوں میں بھی، میں کہہ سکتا ہوں کہ دین کے ان دو (basic ideas) بنیادی تصورات یعنی ذوقِ عبادت اور حسنِ معاشرت کو میں نے بہترین اور کامل ترین صورتوں میں مولانا کی شخصیت میں (actualize) عملی جامہ پہنتے ہوئے دیکھا ہے۔

اب آپ سوچ لیں کہ اس شخصیت کو کسی مزید مدح کی، کسی مزید پہلو سے تعریف کیے جانے کی حاجت ہو سکتی ہے جو اپنے دین کے دو بنیادی آئیڈیاز (تصورات) کو عمل میں لانے میں کامیاب ہو چکا ہو۔

اس کے لیے صرف اتنی ہی مدح پوری طرح کافی نہیں ہے کہ یہ وہ شخص ہے کہ اس کے دین نے اِس سے جو چاہا، اُس نے پورا کر دکھایا۔ مولانا کا آخری تعارف یہ ہے کہ ہمارے دین نے علم، اخلاق، کردار، عمل، ذہن، نفس، طبیعت، قلب، غرض کسی بھی پہلو سے جو بھی مطالبۂ کمال اپنے صادق وابستگان سے رکھا، مولانا نے ان تمام مطالباتِ کمال کو اپنی ذات سے پورا کر کے دکھایا۔ اور ان کمالات کے اظہار سے ہمیشہ کراہت رکھی۔ ہمیشہ ان کمالات کو دوسروں پر منکشف ہونے سے روکنے کا نہایت شدت پسندی کے ساتھ اہتمام کیے رکھا۔ یہ تھے ہمارے مولانا۔ یہ تو ایک حصہ بھی شاید نہیں ہے لیکن بہر حال ایک اصولی ساخاکہ اگر بنالیں، تو ہمارے مولانا اپنی شخصیت میں یہ تھے۔

اُن کا پورا نظام العمل، ان کے تمام اعمال چاہے وہ عبادات کے ذیل سے ہوں، چاہے معاملات کے پہلو سے ہوں، چاہے اللہ کی طرف عابدانہ یکسوئی کے ساتھ ہوں، چاہے وہ معاشرے کے لیے مفید شخصیت کے طور پر ہوں، ان کے تمام اعمال بہترین اخلاق اور عالی ترین علم کے تال میل سے پیدا ہوتے تھے۔ ان کا ہر عمل اخلاق اور عمل کی منتہائی یکجائی سے جنم لیتا تھا۔ ان کے ہر عمل سے عالم تعلیم حاصل کر سکتا تھا، جاہل تربیت حاصل کر سکتا تھا۔ یہ مولانا کی ایک شان تھی۔

وہ جو مولانا کے بھول پن کا ذکر کر رہے تھے، وہ عام آدمی کا بھول پن نہیں تھا۔ وہ اچھے آدمی کی نادانی سے پیدا ہونے والا بھول پن نہیں تھا۔ بلکہ فطرت کی (purity) کھرے پن کو اپنے اندر جذب

کرنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بھول پن تھا مولانا کا۔ اُس بھول پن کے بے شمار نہ سہی، تو دس بیس مظاہرے تو میں نے بھی دیکھے ہیں۔ اور مولانا کے بھول پن کا ہر اظہار، دیکھنے والے کے نفس میں پاکیزگی کی ایک حالت ضرور پیدا کرتا تھا۔ اور وہ دوسرے کو ہنسنے کی اجازت نہیں دیتا تھا، بلکہ اس کو دیکھ کر مولانا کی عظمت، عقیدت اور محبت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اور صاف لگتا تھا کہ فطرت اپنی اصلیت کے ساتھ اگر کارفرما ہو، اور علم اگر اپنی حقیقت کے ساتھ شعور کا مرکز بن چکا ہو، اور ان دونوں کی موجودگی میں اخلاق اپنی اصلیتِ عاجزی کے ساتھ طبیعت کے معمار بن چکے ہوں، تو پھر اس طرح کے بھول پن اور معصومیت کے رویے کی پیدائش عمل میں آتی ہے۔ تو مولانا کا بھول پن، عارف کا بھول پن تھا۔ عاشق کا بھول پن تھا۔ عالم کا بھول پن تھا۔ وہ کسی نادانی یا لاعلمی سے پیدا ہونے والا بھول پن

نہیں تھا۔ وہ اپنی جگہ اچھا ہوتا ہے۔ لیکن مولانا کی اچھائیاں صرف اچھائیاں نہیں تھیں، بلکہ اپنے دین کی اقدار کی ترجمانی کر دینے والے اعمال کی حیثیت رکھتی تھیں۔ مولانا گویا چلتا پھرتا دین تھے، تو ان کا بھول پن بھی دین کے ساتھ تعلق میں، اور دین کے ساتھ ہماری معرفت میں اضافے کا سبب بنتا تھا۔

مثال کے طور پہ، مولانا کے خطبات میں جا بجا دیکھیں گے کہ یہ فرماتے ہیں کہ یہ بات ہزار سال میں کسی عالم نے نہیں کہی، میں بتا رہا ہوں۔ یہ بات اللہ نے مجھے سجھائی ہے۔ اب تک کے علماء کو یہ بات نہیں سوجھی تھی۔ آج کل کا کوئی پیشہ ور ریڈر (قاری) جس کو ریڈر شپ (قرأت متن) کے قواعد کا اور الفاظ کی حقیقی دلالتوں کا بالکل علم نہ ہو، جو کلام کو متکلم کے اعتبار پر سمجھنے کی قابلیت سے محروم ہو، وہی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ جیسے کسی خود پسند آدمی کا کلام ہے۔

کیونکہ آج کل کا آدمی جو ہے وہ بات کو بات کہنے والے سے جوڑ کر
دیکھنے کی بصیرت سے محروم ہے، لہذا اس کے نزدیک بس بات،
پوری کی پوری، جن لفظوں میں بیان ہوئی ہے ان لفظوں کے
بارے میں اس کا جو ناقص علم ہے، اس ناقص علم کو حَکَم اور حُجت بنا
کر وہ متکلم پر الفاظ کی سطحی دلالتوں کو تھوپ دیتا ہے۔ یہ وہ بدترین
کرپشن ہے جو جدیدیت نے، جدید تعلیم نے ہمارے ذہنوں پر مسلط
کی ہے۔ جس نے کلام کو متکلم پر غالب کیا ہے۔ اور کلام تو ایک
بہانہ ہے۔ جس نے اپنے فہم کو حُجت بنا کر متکلم پر اور شخصیتوں پر اور
تمام اقدارِ معانی پر اور تمام اسالیبِ حقائق پر غالب کرنے کی ضد باندھ
رکھی ہے۔ تو یہ جیسے مینڈکوں کے دماغ سے انبیاء علیہم السلام کے
وارثوں کا کلام سننے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اِن کا کوئی ذکر نہیں اور نہ
مجھے ان لوگوں کے سامنے کسی وضاحت کی ضرورت ہے۔ لیکن

ویسے ہی میں کہہ رہا ہوں کہ یہ فقرہ بظاہر عجیب سا لگتا ہے ناں کہ ہزار برس سے کسی عالم کو یہ بات نہیں سوجھی، یہ مجھ پر منکشف ہوئی ہے۔ یہ مولانا کا بھول پن تھا۔ ورنہ تو سیدنا سلیمان علیہ السلام نے کیا دعا فرمائی تھی کہ یا اللہ، مجھے ایسی سلطنت دے جو نہ مجھ سے پہلے کسی کو ملی ہو اور نہ میرے بعد کسی کو ملی ہو۔ اب کوئی آدمی، یا کوئی اناڑی دین دار آدمی، کوئی اناڑی پن کی صوفیت رکھنے والا بے وقوف جاہل شخص، اس دعا میں کیا کیا مضمرات تلاش کر سکتا ہے اپنے نفس کی گندگی کو، اپنے دماغ کی جہالت کو اپنا رہنما بنا کر۔ تو یہ نہیں ہے، یہ اللہ سے تعلق کی کچھ سطحیں ہوتی ہیں، یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ تعلق کے کچھ احوال ہوتے ہیں، جو تحدیثِ نعمت کے طور پر جذبۂ تشکر میں وفورِ شکر گزاری کے ساتھ زبان سے ادا ہو جاتے ہیں۔ تو مولانا کے ہاں بھی یہ جیسے ایک نہایت سادہ اور بھولے عارف اور عالم کا

وہ بیان ہے جس کی تردید آپ نہیں کرسکتے۔ بات یہ صحیح ہے۔ مولانا نے جہاں کہا ہے کہ ہزار برس میں کسی کو یہ بات نہیں سوجھی، وہاں یہ بات بالکل درست ہے۔ ہم دکھا سکتے ہیں کہ ہزار برس میں وہ بات کسی بھی ذہن میں نہیں آئی جس کے لیے مولانا اپنی انفرادیت کا ایک معصومانہ سا دعوی کر رہے ہیں۔ معصومانہ، میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کے جواب میں، میں ایک واقعہ (quote) نقل کرنے جا رہا ہوں جو خطبات میں ہے۔ یہ ایسا نہیں کہ میں کہوں کہ صرف میں نے سنا ہے۔ یا سنی سنائی بات ہے۔ یہ مولانا کے خطبات میں ایک خطبہ ہے 'کچھ اپنے بارے میں' کے عنوان سے۔ چھوٹا سا ڈیڑھ دو صفحے کا وہ خطبہ ہے۔ تقریر ہے مولانا کی کہ مولانا سے کسی ناسمجھ آدمی نے یہ کہا کہ مولانا، آپ کبھی کبھی جو ہے متکبر ہو جاتے ہیں۔ تو مولانا ایک

دم چونکے اور جیسے سچا آدمی ہوتا ہے ناں کہ اس کو اپنے عاجزانہ کلام اور اپنی عاجزی کی نمائش سے پر جھانے اور قائل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جھوٹے آدمی کی پہچان یہی ہوتی ہے کہ اگر اس سے کوئی یہ کہہ دے کہ تم نیک نہیں ہو، تو وہ فوراً نیک ہونا (perform) کرنے لگے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ جھوٹا آدمی ہے۔ وہ غصے میں آ جائے اور اضطراری طور پر ناگواری کا اظہار کرے، تو اس کا مطلب ہو گا کہ یہ سچا آدمی ہے۔ یہ معترض جو ہے، جاہل ہے۔ مولانا نے اس معترض کے جواب میں یہ فرمایا کہ لاحول ولا قوۃ، یہ کیا بکواس ہے۔ جو آدمی اپنے استاد سے پڑنے والی مار پر فخر کرتا ہو، جو اپنے استاد کی قمچیوں کی ضرب سے کمر پر بن جانے والے نشانات کے مٹ جانے کا افسوس کرتا ہو، وہ بھلا متکبر ہو سکتا ہے۔

یہ فقرہ بھی، آپ کو میں اس کا ایک مختلف (context) سیاق و سباق سناتا ہوں جس میں رکھ کر اس فقرے کے معنی ثابت ہوں گے کہ ہزار برس سے یہ بات چھپی ہوئی تھی۔ مولانا نے کہا کہ میں جن لوگوں پر، بڑے بڑے لوگوں پر تنقید کرتا ہوں، تو میں اسی طرح کا عمل کر رہا ہوتا ہوں کہ ایک آدمی باہر سے سمندر کو دیکھ رہا ہے، اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی ہے، ایک (stick) ہے، تو وہ یہ بتا دیتا ہے کہ سمندر یہاں سے اتنا گہرا ہے اور یہاں دو فٹ کا رہ گیا ہے۔ جہاں سمندر اس چھڑی کی رینج میں آجاتا ہے، یعنی اس کی پیمائش میں آجاتا ہے کہ یہاں سمندر دو فٹ تین فٹ کا رہ گیا ہے، تو وہاں میں بتا دیتا ہوں کہ یہ سمندر دو تین فٹ کا رہ گیا ہے، سمندر کے اس حصے کو سمندر نہ سمجھو۔ سمندر وہ ہے جس کو میری چھڑی ناپ نہیں سکتی۔ تو

میں ہر آدمی پہ تنقید، یہ مان کر، یہ جان کر، یہ جتا کر، کرتا ہوں کہ یہ صاحب، سمندر ہیں لیکن ہر سمندر کی طرح ان کے کچھ ساحلی حصے ایسے ہیں جو دو فٹ گہرے ہیں، جو اتنے گہرے نہیں ہیں جتنا سمندر بیچ میں ہوتا ہے۔ اور کبھی یہ وہم نہ پالنا کہ میں شاہ عبدالعزیز ایسے لوگوں پہ تنقید کروں تو نعوذباللہ، میں خود کو ان کے برابر کا سمجھ رہا ہوں۔

میرے اور ان کے علم میں وہ نسبت بھی نہیں ہے جو انگلی ڈبونے کے بعد، انگلی پہ لگے ہوئے پانی اور سمندر میں ہوتی ہے۔ یہ مولانا نے خاص اہتمام کر کے یہ وضاحت کی ہے اور یہ ان کے مقالات میں موجود ملے گی۔ انشاء اللہ، جب آپ دیکھیں گے۔ 'کچھ اپنے بارے میں'۔

اسی طرح مولانا کے بھول پن کے بہت واقعات ہیں لیکن یہ بھول پن اپنے متوازی ایک فراست بھی رکھتا ہے۔ ایک ناقابل یقین

فراست اور مولانا اپنی طبیعت کے بھول پن اور اپنے ذہن کی فراست کو زیادہ فاصلے پر نہیں رکھتے تھے بلکہ اس کو جوڑ کر چلاتے تھے۔ میں اس کا ایک واقعہ سناتا ہوں جو خود میرے ساتھ گزرا۔ میں ہوائی چپل پہنا کرتا تھا۔ وہ ہوائی چپل، ربڑ کی معمولی چپل جو ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ وہ کہیں سے ٹوٹ گئی، اس کا پٹا ٹوٹ گیا۔ میں نے اسے سلوایا ہوا تھا۔ مولانا نے وہ دیکھ لیا۔ پہلے دیکھ لیا ہوگا، اپنے اندر محفوظ رکھا۔ ایک مرتبہ میں بازار میں، انھیں کے گھر کی طرف بازار سے جا رہا تھا، تو مولانا وہیں بازار میں کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کے بلایا اور کہا کہ بھئی، کوئی مصروفیت تو نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ جناب، کیا مصروفیت ہے۔ اگر میں اس وقت یہ کہہ دیتا کہ میں تو خود ہی آپ کے گھر حاضر ہونے جا رہا تھا، تو اس پہ وہ ڈانٹتے کہ جتا رہے ہو مجھے۔ بہت نزاکت تھی۔ میں نے کہا کہ جی جی، بالکل حاضر۔ کہنے

لگے کہ مجھے ایک جوتا لینا ہے۔ تم لوگ چونکہ دکان وغیرہ کے بارے میں معلومات رکھتے ہو، تو یہاں کی جو سب سے بڑی اور اچھی دکان ہے جوتوں کی، وہاں لے جاؤ۔ اب مجھے کیا اتنی معلومات۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کے جو سب سے بڑی دکان نظر آئی، وہاں لے گیا انھیں۔ وہاں جا کر انھوں نے کچھ جوتے دیکھے، نیگیٹو ریمارکس (منفی تبصرے) کیے۔ یہ اچھا نہیں، یہ اچھا نہیں۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگے کہ یار، میری تو کچھ سمجھ میں آ نہیں رہا۔ تم بتاؤ، کوئی اچھا جوتا۔ دو تین جوڑے دیکھ کر بتاؤ۔ میں نے انھیں بتایا کہ یہ اچھا لگ رہا ہے، یہ اچھا لگ رہا ہے۔ کہنے لگے کہ نہیں، اپنے خیال سے دیکھو۔ جوان آدمی کیسا پہنتا ہے۔ عجیب طرح سے کہا، تو میں نے کہا کہ یہ اچھا لگ رہا ہے، یہ اچھا لگ رہا ہے۔ کہنے لگے، پہن کے دیکھو۔ ذرا بتاؤ، آرام دہ ہے یا نہیں۔ اب میں اسی وہم میں ہوں کہ یہ مولانا اپنے لیے

خریدنے کے لیے کہ مولانا کو چلنا اٹھنا بیٹھنا زیادہ پسند نہیں ہے، اس وجہ سے کہ جوتا پہن کے چلنا پڑتا ہے، مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ میں نے اپنے ناپ کا ایک جو بہترین جوتا ہو سکتا تھا، وہ پہن کے چلنے لگا۔ کہنے لگے کہ آرام دہ ہے۔ میں نے کہا کہ جی، بہت آرام دہ ہے۔ کہنے لگے، آج تمھارے ذوق کا پتہ چل گیا۔ یہاں سارے جوتے انسانوں کے پہننے کے لیے نہیں ہیں، جانوروں کے پہننے کے لیے ہیں۔ یہ کھر ہیں، جوتے نہیں ہیں۔ لیکن چلو، تمھارے لیے تو ٹھیک ہے ناں۔ یہ کہہ کے مجھے انھوں نے وہ جوتا دلوا دیا۔ اب کیا کہ انھیں جوتا دلوانا تھا اور اپنا ممنون نہیں بنانا تھا۔ انھیں احسان کرنا تھا اور اپنا ممنون نہیں بنانا تھا، تو اس طرح بے عزت کر کے، جانور بنا کر وہ جوتا مجھے دے دیا۔ وہ جوتا میں کبھی نہ خرید سکتا، اس کو پہننے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتا۔

یا ایک مرتبہ مجھے سو روپے کا نوٹ دیا۔ فرمایا کہ اس وقت میرے پاس پان نہیں ہے۔ جلدی سے ایک دو پان یہیں سے لے آؤ، محلے سے اور جلدی آؤ۔ اب سو روپے کا نوٹ اس زمانے میں، ایک پان لے کر جو ایک آنے کا پان آتا تھا، وہ لے کر سو روپے کا نوٹ بھُنانا (یعنی ریزگاری لینا)، یہ ناممکن کام تھا۔ اور مولانا کا حکم بھی تھا، تو میں بس سٹاپ پہ گیا۔ وہاں کنڈکٹر جو ہوتے ہیں ان سے بڑی مشکل سے سو روپے کا کھُلا کروایا (ریزگاری لی)۔ پھر آ کے پان لیا اور پان لے کے مولانا کی خدمت میں پہنچا۔ اب ظاہر ہے کہ ایک کلومیٹر آنے جانے میں کچھ وقت لگا۔ کہنے لگے کہ اتنی دیر؟ اور تم لوگوں کو بالکل کسی کی ضرورت کا احساس نہیں ہے، کچھ تمہیں فکر نہیں کہ میرا کیا حال ہو رہا ہوگا۔ یہ کہہ کے پان لیا اور پیسے میں نے پکڑائے، سنتا بھی جا رہا تھا۔ پیسے اٹھا کے یوں پھینک دیے میری طرف۔ کہا، یہ اپنے

پاس رکھو، دفع ہو جاؤ، مجھے ضرورت نہیں ہے۔ نہ اس پان کی ضرورت ہے، نہ پیسوں کی۔ پان بھی پھینکا، پیسے بھی میرے منھ پہ مارے اور کہا کہ یہ لے کر دفع ہو جاؤ۔ اب اس لہجے میں ایسی بات تھی کہ نہ میں پیسے لینے سے انکار کر سکتا تھا، نہ دفع ہونے سے رک سکتا تھا۔ اب انھیں کیا تھا۔ انھیں مجھے سو روپیہ دینا تھا۔ لیکن سو روپے دینے کے لیے وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ میری آنکھوں میں کوئی تشکر یا ممنونیت دیکھیں۔ یا میرے اندر کسی ایسے جذبے کو پیدا ہونے کا موقع دیں جو احسان مندی کا جذبہ ہوتا ہے، جو جیسے اپنی محتاجی کے احساس کو بڑھاتا ہے، تو انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس طرح بے عزت کیا اور اپنے منصوبے پہ عمل کر لیا۔

یہ فراست ہے جو میں کہا سکتا ہے کہ میں نے مولانا کے علاوہ کہیں نہیں دیکھی۔ ایسی شخصیت آپ لا کے تو دکھائیے، جو احسان کو ناگوار

بنا دے ممنونِ احسان کے لیے ۔ ایسا احسان کرنا ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہونے والی خاص ترین فراست کے بغیر ممکن ہے کہ جس پہ احسان کریں وہ اس پر تشکر کے جذبے کا احساس بھی غیر فطری سمجھے ۔ یہ تھے ہمارے مولانا ۔

**

جناب احمد جاوید سے ایک ملاقات

سید مطیع الرحمٰن مشہدی

الشریعہ اکادمی

http://alsharia.org/2020/aug/javed-ahmad-mulaqaat

جنوری 2020 کے آخری دنوں کی بات ہے، ایک دن کلاسز سے فارغ ہونے کے بعد محترم رفیق کار میاں انعام الرحمٰن حسب معمول میرے پاس اسلامک ڈیپارٹمنٹ میں تشریف لائے اور معمول کی گپ شپ شروع ہوئی۔ باتوں باتوں میں بات ملک کے معروف دانش ور، صوفی، فلسفی اور ادیب محترم جناب احمد جاوید صاحب کے

بارے میں چل پڑی۔ اسی گفتگو کے اختتام پر یہ طے پایا کہ ان سے ملاقات کی کوئی سبیل نکالی جائے۔ میاں انعام صاحب کا غائبانہ تعارف ان سے الشریعہ میں وقتاً فوقتاً چھپنے والے مضامین کے توسط سے ہو چکا تھا۔ چنانچہ میاں انعام صاحب کے نہایت نفیس دوست عمران مرزا صاحب سے گزارش کی گئی کہ وہ احمد جاوید صاحب سے کسی دن کا کوئی مناسب وقت لے کر مطلع فرمائیں۔ 8 فروری 2020 بروز اتوار بعد از ظہر کا وقت عنایت ہوا۔ ڈاکٹر پروفیسر محمد اکرم ورک، میاں انعام الرحمٰن، ڈاکٹر سلطان شمس الحق فاروقی اور راقم الحروف مقررہ وقت پر ان سے ملاقات سے شرف یاب ہوئے۔ یہ ایک غیر رسمی ملاقات تھی، اس لئے کسی متعین موضوع کی بجائے مختلف موضوعات پر ہلکی پھلکی گفتگو ہوئی۔ بنیادی مقصد ان کی زیارت کرنا اور ان کی صحبت میں چند لمحے گزارنا تھا۔ ڈاکٹر شمس

الحق فاروقی کا نہایت شکر گزار ہوں کہ ان کی ریکارڈنگ کی بدولت یہ ملاقات صفحہ قرطاس پر منتقل کی جا سکی۔ رودادِ ملاقات ملاحظہ کیجیے۔

مطیع مشہدی: مولانا ایوب دہلوی صاحب سے آپ کی باقاعدہ ملاقات رہی ہے؟

احمد جاوید صاحب: تقریباً دو سال کے لگ بھگ میں ان کی صحبت میں رہا۔ میری عمر اس وقت کم تھی۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ شاگرد تھا۔ خادم تھا، پان لا کے دے دیا، وغیرہ۔

میاں انعام الرحمان: ہمارا ان سے تعارف ان کی چھوٹی سی کتاب 'فتنہ انکار حدیث' سے ہوا۔ بہت اچھا لکھا ہے، بہت مختصر اور جامع۔ جب اس کا عنوان دیکھا تو میں نہیں لے رہا تھا کہ پتہ نہیں کیا ہو گا، لیکن جب اس کے صفحے اُلٹے تو دلچسپ لگی، لے آیا۔ اس سے ان کا تعارف ہوا، پھر ان کی مزید کتابیں ڈھونڈیں تو سوشل میڈیا پر

ایک صاحب نے بتایا کہ ان کے پاس 'مقالات دہلوی' کی فوٹوکاپی ہے، وہ اتنے ہزار کی ہے۔ خاصی مہنگی تھی۔ پھر میں نے اس کی پی ڈی ایف ڈھونڈلی۔

احمد جاوید صاحب : اصل کام ان کا وہی ہے مقالات دہلوی، جو ان کی تقریریں ہیں۔ یہ جو انکار حدیث ہے، یہ انہوں نے اپنے قلم سے لکھا ہے۔ حالانکہ لکھنے کی مشق بالکل نہیں تھی۔ تین رسالے انہوں نے اپنے قلم سے لکھے ہیں، مسئلہ جبر وقدر، ختم نبوت اور فتنہ انکار حدیث، جس میں انہوں نے سوال جواب قائم کر کے مدرسانہ انداز میں لکھا ہے۔ ان کو لکھنے سے بالکل مناسبت نہیں تھی۔ بولنے پر تھی۔ وہ عجیب عالم تھے، ان کو دیکھنے کے بعد کوئی شخص عالم نہیں معلوم ہوتا۔ سب سطحی باتیں، ناقل ہیں، عالم نہیں ہیں۔ یہ مسئلہ یہ ہے، یہ فلاں کتاب میں لکھا ہے۔ عالم جو ہوتا ہے علم والا، مطلب

تاثر ہے، ہوں گے ظاہر ہے بڑے بڑے عالم، لیکن ان کو جس نے بھی دیکھ لیا نا، وہ بیچارہ بعد میں پریشان ہی رہا۔ وہ ہر ایک میں انہیں ڈھونڈنے لگتا ہے۔ کرداراور علم دونوں اپنی منتہیٰ پر تھے۔ اور علم متوسط نہیں، منتہی۔ کردار میں بھی اور علم میں بھی۔ ان کی سپیشیلٹی معقولات میں تھی۔ ان کی للہیت کا کیا عالَم ہوگا کہ فلسفہ پڑھا رہے ہیں اور لوگ رو رہے ہیں۔

**

عاجزی وانکساری کا منبع ۔ مولانا محمد ایوب دہلوی

نصیر سلیمی

7اکتوبر,2021

https://jaeza.pk/taasrat/maulanamuhammadayubdehlvi-naseersaleemi/

مذکورہ مضمون فروری 2016 میں اردو ڈائجسٹ میں شائع ہوا

مولانا محمد ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ایک عظیم علمی شخصیت تھے۔ ایک ایسی شخصیت جو بیک وقت علومِ قرآنی اور تشریح حدیث میں جہاں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے وہاں درویشی اور بے نیازی ان کے ظاہر و باطن پر حاوی تھی۔ وعظ و تقریر ان کا مشرب علمی تھا، اس لیے تحریر کی جانب طبیعت مائل نہیں تھی۔ اپنے نطق و کلام سے علم کی گرہیں کھولتے رہتے تھے۔ اب ایسے افراد دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔

برصغیر پاک وہند میں اسلام کی روشنی تو عرب تاجروں کے ساتھ آئی تھی، مگر اسلام کی دعوت سے اِس خطے میں بسنے والوں کے دلوں کو

مسحور کرنے اور اس دعوت کو عام کرنے کے لیے علمائے کرام اور صوفیائے عظام کی ذاتی زندگیوں کے صاف ستھرے کردار نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اس خطے کی ایک ہزار سالہ تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ علماء و صوفیاء نے قرآن فہمی، احادیث مبارکہ اور سیرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ و سلم کی جمع و تدوین، اسوۂ صحابہ اور علم الکلام کی نکتہ رسی میں جو اہم ترین خدمات انجام دیں، اس کی مثال دنیا کے کسی اور خطے میں شاذونادر ہی موجود ہو۔ اس مختصر مضمون میں اس تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ تاہم ان میں سے کچھ اہم اور بڑے ناموں کے ذکر سے صرف نظر کر کے آگے بڑھنا بھی ممکن نہیں ہے۔ علامہ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ

علیہ ، شاہ فضل امام خیر آبادی اور بحر العلوم کے نام سے شہرت پانے والے ملا عبدالعلی فرنگی علی سے لے کر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ، مولانا شاہ اسحٰق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ، مولانا عبدالحکیم ٹھٹھوی رحمۃ اللہ علیہ ، مولانا احمد علی محدث سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ ، مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ، علامہ فضل حق خیر آبادی ، مولانا محمد قاسم نانا توی رحمۃ اللہ علیہ ، مولانا ثناء اللہ امر تسری ، مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ ، مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ، مولانا عبدالحئی فرنگی محلی ، مولانا عبدالحق حقانی رحمۃ اللہ علیہ ، علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ، علامہ غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ ، مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ ، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ، مولانا مسعود عالم ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور بعد کے لاتعداد علماء کی

خدمات ہمارے علوم اسلامی کی تاریخ کا سنہرا باب ہیں۔ بیسویں صدی کی اولین دہائیوں میں بھی ایسے دیدہ وراور صاحب بصیرت علماء منظرِ عام پر آئے جنھوں نے جدید تقاضوں کے مطابق اسلامی موضوعات کی تفہیم واشاعت کو اپنا مقصدِ حیات بنایا اور ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جو آج بھی ہمیں دین کے حوالہ سے ہر قسم کی گمراہی سے محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ ماضی قرب کے علماء میں سے ایک عالم دین مولانا محمد ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو اپنے عہد کے جید اور با عمل بزرگ تھے۔ خدا نے ان کو بلا کا طبّاع ذہن دیا تھا۔ علومِ اسلامیہ کے تمام مضامین میں ان کو مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ خصوصاً منطق اور فلسفہ و حکمت میں اور علم الکلام کی نکتہ رسی میں تو بلاشبہ وہ اپنے عہد کے رئیس المتکلمین تھے۔

معروف ادیب اور مولانا محمد ایوب کے معاصر ملا واحدی نے مولانا محمد ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ''وہ تنہا شخص ہیں جنھوں نے اپنے استاد مولانا محمد اسحٰق رام پوری سے پورا فیض حاصل کیا اور ایک چیز تو ایسی حاصل کرلی کہ مولانا محمد اسحٰق پر بھی فوقیت لے گئے'' یعنی مولانا محمد ایوب علمی اور دقیق مضامین ایسی عام فہم زبان میں بیان کرتے ہیں کہ بے پڑھے لکھے مسلمان اور اسلام سے ناواقف غیر مسلم بھی سمجھ لیتے تھے۔ مولانا نے قرآن فہمی کے متلاشی اہل علم کی تشنگی بھی دور کی اور کم علموں کو بھی سادہ اور سہل زبان میں قرآن پاک پڑھنے اور سمجھنے کی راہ دکھائی۔ مولانا کی فکر کی اساس، قرآن پاک اور حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر تھی۔ قرآن پاک کی قدیم و جدید کوئی ایسی تفسیر نہ تھی جو آپ کی نظر سے نہ گزری ہو اور جس کا حوالہ وہ اپنے بیان میں نہ دیتے ہوں۔ ان کی

مجالس کی انفرادیت یہ تھی کہ وہاں ہر ایک سوال اٹھاتا اور تسلی بخش جواب پاتا تھا۔ مولانا کی مجلس میں سوال اٹھانا معیوب نہیں، مستحسن تھا۔

مولانا ایوب دہلوی نے 1888ء میں دہلی میں تجارت پیشہ برادری کی پراچہ فیملی میں جناب عبدالرحمٰن کے گھر میں آنکھ کھولی۔ آپ کے والد محترم عبدالرحمٰن پراچہ دہلی میں کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ مولانا نے بھی تحصیل علم کے بعد تجارت ہی کو ذریعہ معاش بنایا۔ مولانا دہلی میں ساڑھیوں کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ پھر کراچی آکر پہلے کپڑے کی تجارت، بعدازاں ایم اے جناح روڈ پر لائٹ ہاؤس کے قریب شرافت اینڈ کمپنی کے برابر کی دکان میں لیدر گڈس سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ کی فروخت شروع کردی تھی۔ کاروبار سے ان کی دلچسپی بس اتنی ہی تھی کہ اس سے سادگی اور کفایت شعاری کے ساتھ

گھریلو اخراجات پورے ہو جائیں اور روز کی دال روٹی کا انتظام ہو جائے۔ اس سے زیادہ کاروبار کی ان کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ مولانا دکان دو چار گھنٹے کے لیے ہی کھولتے تھے۔ جیسے ہی روز کی ضروریات کے مطابق آمدنی ہو جاتی، دکان بند کر کے نکل پڑتے۔ عموماً ظہر کی نماز سے قبل دکان بند کر کے قریبی مسجد میں نماز ادا کرتے اور گھر جا کر کھانا کھاتے، بعد ازاں قرآن پاک کے مطالعہ میں مستغرق رہتے۔ مولانا کا معمول تھا کہ وہ اپنے کھانا اپنے گھر پر افرادِ خانہ کے ساتھ کھاتے۔ کسی نے ان کو گھر سے باہر کسی دوسرے کے دسترخوان پر کھاتے پیتے نہیں دیکھا۔ مولانا گھر کا سودا سلف خود خرید کر لاتے۔ پسند کا گوشت خریدنے کے لیے دو میل پیدل چل کر جاتے۔ مولانا کو اعلیٰ درجہ کا قورمہ پکانے پر کمال حاصل تھا۔ ایک بار دہلی میں ہمدرد دواخانہ کے مالک حکیم عبدالحمید اور ملا واحدی کی درخواست پر

قورمہ تو پکا دیا، مگر خود ان کے ساتھ نہیں کھایا۔ حکیم عبدالحمید اور ملا واحدی نے کھانے پر اصرار کیا تو جواب میں کہا کہ میرا معمول ہے کہ میں گھر والوں کے ساتھ کھانا کھاتا ہوں۔ آپ اصرار کر کے میرے معمولات میں فرق نہ ڈالیں۔

مولانا ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائی تعلیم مروجہ رواج کے مطابق دہلی کی جامع مسجد میں حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم اور حفظِ قرآن کے بعد اپنے عہد کے نہایت جید عالم مولانا محمد اسحٰق رام پوری سے قرآن و حدیث، تفسیر و فقہ و منطق و فلسفہ میں تحصیل علم کی۔ مولانا عبدالسلام نیازی بھی مولانا اسحٰق کے شاگرد تھے۔

مولانا محمد اسحٰق رام پوری خیر آبادی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا محمد ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی فکر بھی خیر آبادی منطقی فکر کی نمائندہ تھی۔ آپ فقہ حنفی کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ چاروں

فقہی مسالک کو درست سمجھتے اور کسی ایک کی پابندی کو ضروری مگر اندھی تقلید کے قائل نہ تھے۔ عظمتِ صحابہ (رضوان اللہ علیھم اجمعین) کے بارے میں ان کا قول تھا کہ بعد کے تمام علماء اور صوفیاء کا مرتبہ ایک ادنی صحابی (رضی اللہ عنہ) سے بھی کم ہے۔ ایک صاحب کے سوال کے جواب میں کہ 'مسلمانوں کے انحطاط کا باعث کیا ہے؟' مولانا نے فرمایا تھا کہ 'جب سے مسلمانوں نے تقلید پر اتفاق و اتحاد کیا اور تدبر فی القرآن سے ہٹ گئے، وہ ذہنی انتشار کا شکار ہو کر بکھر گئے'۔ جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ فقہ حنفی کے مقلد ہونے کے باوجود اندھی تقلید کو امتِ مسلمہ کے حق میں درست نہیں سمجھتے تھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ اپنے اس قلق کا بڑے دکھ کے ساتھ اظہار کیا کرتے تھے کہ ''میں نے زندگی بڑا حصہ دوسرے علوم کے حصول میں ضائع کیا۔ اگر میں کلام پاک ہی کا

مطالعہ کرتا رہتا تو مجھے سارے علوم یہیں سے مل جاتے۔ یہ کتاب ساری کتابوں پر بھاری اور اس کا علم سارے علوم کا سرچشمہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے دل روشن ہو جاتا ہے اور کائنات کے اسرار و رموز سامنے آجاتے ہیں۔ وہ پردے جو خالق و مخلوق کے درمیان حائل ہیں، بصیرتِ قرآنی سے کھلنے لگتے ہیں''۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ اور تقاریر روایتی واعظوں کی طرح کی نہیں ہوتی تھیں بلکہ قرآن پاک کے حوالے سے غور و فکر کی طرف مائل کرنے والی ہوتی تھیں۔ اندازِ بیاں خالص علمی ہوتا اور طرزِ استدلال میں منطق، فلسفہ اور علم الکلام کی نکتہ آفرینی ہوتی تھی۔ زبان ایسی سہل اور سادہ استعمال کرتے جس سے عام آدمی بیان کا مقصد اور مفہوم بآسانی سمجھ لیتا تھا۔

ان کی مجالس اہل علم کے لیے ہوتی تھیں مگر مجھ جیسے افراد بھی کچھ نہ کچھ فکر کے موتی لے کر اٹھتے تھے ۔ اس ناچیز کو لڑکپن میں یعنی پچاس کی دہائی میں پہلی بار مولانا کے دیدار کا شرف حاصل ہوا تھا اور ان کی مجلس میں بیٹھنے کی پہلی بار سعادت اوائل جوانی یعنی ساٹھ کے عشرے میں حاصل ہوئی تھی جس کا ذریعہ میرے دوست حافظ عزیز الرحمٰن بنے تھے ۔ حافظ عزیز الرحمٰن کے والد حکیم لطف الرحمٰن بقائی اور پھوپھا حکیم حافظ محسن الدین بقائی کا مطب ''سلیمانی دواخانہ'' ٹھٹھائی کمپاؤنڈ میں تھا ۔ حکیم حافظ محسن الدین بقائی مولانا کے بچپن کے بے تکلف دوست تھے ۔

مولانا کا معمول تھا صبح آ کر دکان کھولتے تھے ۔ جتنی دیر میں روز کے اخراجات جتنی آمدنی ہو جاتی تو دکان بند کر کے چل پڑتے ، بعض اوقات تو ایسا بھی ہوا ہے ، ابھی مولانا دکان کھول ہی رہے ہیں کہ

کوئی گاہک ایسا آگیا جس سے اتنی رقم حاصل ہوگئی جس سے ان کے اخراجات پورے ہوجائیں تو مولانا دوبارہ دکان بند کرکے قریب ہی ٹھٹھائی کمپاؤنڈ میں اپنے دوست حافظ حکیم محسن الدین بقائی کے مطب پر چلے جاتے۔ مولانا کے پہنچتے ہی مطب میں مجلس جم جاتی تھی۔ ایسی ہی مجلس میں مجھے پہلی بار مولانا کی گفتگو سننے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ گفتگو کا موضوع تھا، 'خدا پر بندے کو یقین کامل کی کیفیت کب نصیب ہوتی ہے؟' مولانا سے یہ سوال مجلس میں موجود حاجی بشیر احمد نے کیا تھا، جس پر مولانا نے گھنٹے بھر قرآن و حدیث، سیرت طیبہ اور صحابہ کی زندگی کے واقعات کی روشنی میں سادہ اور عام فہم زبان میں ایسی سیر حاصل گفتگو کی تھی جس کی تاثیر آج بھی روزِ اول کی طرح میرے دل پر نقش ہے۔

اللہ نے قناعت کی زندگی دے کر نفسِ مطمئنہ سے سرفراز کیا تھا، جس نے انھیں زندگی بھر حبِ مال اور حبِ جاہ سے محفوظ رکھا۔ جن افراد نے انھیں دیکھا ہے اور ان کی مجلسوں میں شرکت کی ہے، وہ گواہی دیں گے کہ ان کی زندگی میں دنیا اور اہل دنیا سے اجتناب تھا۔ وہ خلقِ خدا سے تو بے پناہ محبت اور انسیت رکھتے تھے اور کسی حاجت مند کی حاجت پوری کرنے کے لیے کسی دوست سے قرض لے کر ضروریات بھی اس انداز سے پوری کیا کرتے تھے کہ سائل کی عزتِ نفس کو مجروح نہ ہونے دیتے تھے۔ مگر اپنی ذات کے لیے کسی سے کبھی کوئی قرض لیتے اور نہ کوئی مدد قبول کرتے تھے۔ حالانکہ ان کی مجلس میں شرکت کرنے والوں میں صنعت و حرفت سے تعلق رکھنے والے کئی بڑے نام بھی ہوا کرتے تھے جن کی خواہش اور کوشش ہوتی تھی کہ وہ مولانا کی کوئی مالی خدمت کر سکیں مگر مولانا نے کبھی کوئی

پیشکش قبول نہیں کی۔ شیخ فضل حسن نے جن کے گھر مولانا اتوار کو درس دیا کرتے تھے۔ ایک بار مولانا کی خدمت میں کلفٹن میں نو تعمیر شدہ ایک گھر کی چابیاں کاغذ میں لپیٹ کر پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا یہ آپ کے گھر کی چابیاں ہیں، مولانا نے حیرت کے ساتھ چابیاں لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ میاں میرے تو گھر میں تالا ہی نہیں ہے، میں وہ چیز کیوں لوں جس کی مجھے حاجت ہی نہیں ہے۔ حالانکہ ضعیف العمری کی وجہ سے آخری دنوں میں مولانا کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی۔ پیروں پر ورم بھی آگیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اسی فلیٹ میں رہے جو ایک کئی منزلہ بلڈنگ کی آخری منزل پر تھا۔ مولانا کی زبان سے توکسی نے یہ بات نہیں سنی، مگران کے قریبی ذرائع سے یہ روایت آتی ہے کہ مولانا فلیٹ توکیا، اپنے بستر کی جگہ بھی تبدیل نہیں کرنے دیتے تھے اوراصرار کرتے تھے کہ میرا بستر اسی جگہ رہنے دیا

جائے ۔ وجہ اس کی یہ بتائی گئی کہ اس جگہ انھیں خواب میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ مولانا کی زندگی اور فکر پر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا گہرا اثر تھا۔ وہ اپنے مواعظ اور تقریروں میں اور تفسیر بیان کرتے وقت بھی حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (رح) کی رائے کو ترجیح دیا کرتے تھے۔

مولانا عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سب سے بڑے عالم تھے اور ان کی ذات پر بریلوی، دیوبندی، خیر آبادی اور اہل حدیث کہلوانے والے غیر مقلدین کا بھی اتفاق و اتحاد تھا۔ مولانا کو اللہ نے مختصر اور مفصل گفتگو کرنے پر ملکہ دیا تھا۔ زبان و بیان پر تو قدرت تھی ہی، موضوع اور موقع و محل کے اعتبار سے گفتگو کرتے تھے، وقت کم ہوتا تو پندرہ بیس منٹ میں بھی مدلل بات کر کے رخصت ہو جاتے۔

تفسیر قرآن بیان کرتے تو ایک ایک آیت کی تفسیر میں کئی کئی گھنٹے لگاتے ۔ حافظ قرآن تھے اور حافظہ بلا کا تھا ۔ قرآن پاک کی آیت کی تفسیر میں پہلے حدیث ، سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ و سلم اور اسوۂ صحابہ پیش کرنے کے بعد قدیم و جدید مفسرین کی آراء کا ذکر کر کے کسی مفسر کی رائے سے اتفاق اور کسی سے اختلاف کرتے تھے ۔ اختلاف میں حفظِ مراتب کا پورا پورا خیال رکھتے تھے ۔ ویسے وہ بیک وقت جلالی اور جمالی صفت رکھنے والے بزرگ تھے ۔ صبر و تحمل بھی بڑا اور عجز و انکسار بھی تھا ، ان کے درس میں ہر مکتبہ فکر کے لوگ موجود ہوتے تھے ۔ اور جدید علوم کے وہ ماہرین بھی جو اپنے اپنے شعبوں میں ممتاز مقام رکھتے تھے ، ان ماہرین میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ، ملا واحدی ، چودھری محمد علی (سابق وزیر اعظم پاکستان) ڈاکٹر محمود حسین ، پروفیسر ایم ایم احمد ، حکیم محمد سعید ، حکیم احسن عباسی ، اے کے

بروہی، ماہر القادری، پروفیسر حسن ریاض، جسٹس عبادت یار خان، جسٹس ظہور الحق، فضل احمد کریم فضلی، مہدی علی صدیقی (سیشن جج)، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، نواب صولت علی خان، ذاکر علی خان، مشتاق احمد یوسفی، مولانا حسن مثنیٰ ندوی، ڈاکٹر امیر حسین صدیقی، نصر اللہ خان، مولانا حکیم قاری احمد پیلی بھیتی (معروف محقق دانش وار خواجہ رضی حیدر کے والد محترم)، علماء کے حلقے میں مولانا حکیم قاری احمد سے مولانا کے بہت قریبی مراسم تھے اور خود مولانا انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ سلیم احمد، احمد اسحٰق، ڈاکٹر ایوب قادری، سید محمود احمد مدنی، حکیم محسن الدین بقائی، اسماعیل احمد مینائی، اے کے سوما، شیخ فضل حسن، غلام احمد اسماعیل، حافظ محمد سعید سوت والے، سید گوہر علی شاہ گیلانی، حکیم محمود احمد برکاتی، حاجی مولا بخش سومرو، خان بہادر حبیب الرحمٰن، شوکت علی دہلوی، حاجی محمد صالح دہلوی، اسلم ملتانی،

محمود احمد خان، حاجی محمد صدیق، حکیم محمد عبداللہ، مراد خان جمالی، یوسف سیٹھی اور عبدالرحمٰن چھاپرا وغیرہ۔ سابق الیکشن کمشنر سندھ محمود احمد خاں نے تو مولانا کی ''ختم نبوت" کے موضوع پر تقریر کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔

کراچی میں مولانا محمد ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے درس کا سلسلہ ملا واحدی، محمد لطیف، اسد ملتانی، حکیم محمد سعید، شیخ فضل حسن، حافظ حکیم محسن الدین بقائی کے مطب سلیمانی دواخانہ اور لسبیلہ چوک پر صدیقی ٹرسٹ میں جاری رہا۔

مولانا محمد ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال 13 دسمبر 1969ء کو کراچی میں ہوا اور تدفین میوہ شاہ قبرستان سے متصل جمعیت پنجابی سوداگران دہلی کے نجی قبرستان یوسف پورہ میں ہوئی تھی۔ مولانا نے نصف صدی سے زیادہ اپنی زندگی قرآن فہمی کو عام کرنے میں صرف

کی۔ چھبیس ستائیس سال دہلی میں ہمدرد دواخانہ میں، ملا واحدی کے گھر حکیم علی رضا خان اور نواب فیض احمد خاں کے دیوان خانے میں وعظ کی مجالس سے خطاب کیا، بلکہ ملا واحدی کے گھر تو وہ روزانہ بیان کی محفل جماتے تھے۔ ملا واحدی نے لکھا ہے کہ 1947ء تک دہلی میں ان کی تقریروں کی تعداد چھ سات ہزار ہو گئی تھی۔ کراچی میں درس دیتے ہوئے ان کی تقریروں کا بڑا ذخیرہ ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی میں اور شیخ فضل حسن کے ہاں کافی تعداد میں موجود تھا۔ کاش مولانا تقریر کی طرح تحریر کی طرف بھی توجہ دیتے تو آج ان کی تصانیف کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہوتا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اپنی تقریریں کسی کو تاجرانہ بنیاد پر شائع کرنے کی اجازت نہیں دی اور نہ ہی اس کام کے لیے کسی کو چندہ کرنے کی اجازت دی۔ مولانا کی جتنی بھی تقریریں کتابی شکل میں موجود ہیں وہ مولانا کے عقیدت مندوں نے اپنے ذاتی

خرچ پر مفت تقسیم کے لیے شائع کی تھیں۔ مولانا کی تقریریں مکتبہ رازی اور صدیقی ٹرسٹ سے شائع ہوتی تھیں۔

صدیقی ٹرسٹ نے مولانا کی تقاریر شائع کیں ان پر یہ عبارت بھی واضح طور پر تحریر تھی کہ صدیقی ٹرسٹ اس کتاب کے لیے کسی سے چندہ وصول نہیں کرتا ہے۔ مولانا کی تقریروں کا ایک مجموعہ تین جلدوں پر 'مقالاتِ ایوبی' کے نام سے شائع ہوا تھا، جس میں مسئلہ ختمِ نبوت، عورت نبیہ کیوں نہیں ہو سکتی، فتنہ انکارِ حدیث، مسئلہ جبر و قدر پر تقاریر ٹیپ سے ٹرانسکرپٹ کر کے مدوّن کی گئی تھیں۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے حوالے سے تقریر 'مقصودِ کائنات' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔ اس پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے بڑا پر مغز پیش لفظ لکھا تھا۔ تفسیر قرآن کی دو دو جلدیں تفسیر ایوبی کے نام سے شائع ہوئیں تھیں، جلد اول میں اعوذ باللہ، بسم اللہ اور

سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے، جب کہ دوسری جلد سورۃ بقرہ کے پہلے رکوع کی تفسیر ہے، تفسیر ایوبی چار سو صفحات کی ہے، اب یہ ساری مطبوعات نایاب ہیں۔ اطلاع ہے کہ اب جناب احمد جاوید کی نگرانی میں ان کے احباب اس علمی ذخیرہ کو شائع کرنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ مولانا کی ساری تقریروں کا ذخیرہ چھپ جائے تو یہ آنے والی نسلوں کو قرآن فہمی کی طرف راغب کرنے میں مؤثر کردار ادا کرے گا۔

مولانا کے علمی کارناموں اور اس کے اثرات کے حوالہ سے کسی بسوط کام کی ضرورت ہے۔ مولانا کے حالاتِ زندگی پر بھی کوئی زیادہ تفصیل سے نہیں لکھا گیا ہے، کچھ معلومات جناب ملا واحدی کی کتاب 'میرے زمانے کی دلی' میں ملتی ہیں، یا ڈاکٹر ناصر الدین صدیقی کی کتاب 'بزرگانِ کراچی' میں۔ مولانا کے حالات کے بارے میں کچھ

زیادہ تفصیل سے سید محمود زین العابدین شاہ راشدی نے اپنی کتاب 'انوارِ علمائے اہلِ سنت سندھ' میں لکھا ہے۔ اب شاید مولانا محمد ایوب (رح) کی اولاد میں سے کوئی زندہ نہیں ہے۔ جب کہ ایک صاحب نے اطلاع دی ہے کہ ان کی ایک صاحب زادی حیات ہیں۔ راقم کی مولانا کے ایک داماد محمد فرید صاحب مالک فریسکو سوئٹ بزنس روڈ کراچی سے راہ و رسم تھی۔ وہ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ محمد فرید کے بیٹے اور پوتے حیات ہیں، وہی اس وقت فریسکو کے مالک ہیں، ان کے پوتے سے ملاقات ہوتی ہے مگر ان کو کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ صدرِ مملکت شیخ ممنون حسین کی بیگم، مولانا کے داماد محمد فرید پراچہ کی سگی بھتیجی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے پاس مولانا کے بارے میں کچھ مزید خاندانی معلومات ہوں۔

مولانا کی ایک بڑی انفرادیت یہ تھی کہ وہ دوسروں کے کام آتے تھے اور کسی پر یہ راز افشا نہیں ہونے دیتے تھے۔ میرے ایک نہایت عزیز دوست جناب غلام احمد اسماعیل نے مجھے بتایا کہ مولانا نے کسی سے کبھی اپنی ذات کے لیے قرض نہیں لیا، جب بھی لیا کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لیے۔ ان کے منہ سے ایک ہی جملہ نکلتا تھا کہ ''میاں ہمیں تم سے کچھ ''ناوے" کی ضرورت پڑ گئی ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ اتنے دنوں میں رب العزت اس کی ادائیگی کا اسی وقت انتظام فرما دیں گے''۔ مجال ہے کہ کبھی ایسا ہوا ہو کہ مولانا کی زبان سے نکلی ہوئی تاریخ اور وقت پر مولانا رقم واپس کرنے نہ آئے ہوں۔ وعدہ ایفا کرنے میں مولانا ایک دن اور ایک گھنٹے کی تاخیر بھی کبھی نہیں ہونے دیتے تھے۔ مولانا کا طریقہ یہ تھا کہ جس کے لیے قرض لیتے تھے، اس سے دریافت کر لیا کرتے

تھے کہ ادائیگی کتنے میں ہو سکے گی۔ وہ جتنے دن بتاتا، مولانا واپسی کا کچھ وقت زیادہ کر دیتے، اگر اس نے اپنے وقت پر ادائیگی کر دی تو مولانا اسی دن واپس کر دیتے، اگر دیر کر دی تو مولانا قرض کی واپسی اسی تاریخ کو ضرور کرتے جس کا مولانا نے وعدہ کیا تھا۔ خواہ اس کے لیے کسی دوسرے سے ہی قرض لینا پڑتا۔ میرے دوست نے ایک بار مولانا سے درخواست کی کہ کسی خدمت کا موقع دیں تو جواب دیا کہ اپنے ارد گرد دیکھیں اور جس ضرورت مند کی ضرورت پوری کر سکتے ہوں، کر دیں۔

میں یہاں چند اقتباسات جناب ملا واحدی، جناب مشتاق احمد یوسفی اور نصر اللہ خان کے مولانا پر لکھے گئے مضامین اور جناب احمد جاوید کے ایک انٹرویو سے نقل کر رہا ہوں۔ جناب ملا واحدی نے اپنی کتاب 'میرے زمانے کی دلی' میں لکھا ہے کہ:

نوٹ : زیر نظر سطور ملا واحدی کی کتاب ''میرے زمانے کی دہلی'' سے مستعار ہیں۔

مولانا محمد ایوب مولانا محمد اسحاق رام پوری کے شاگرد ہیں۔ مولانا محمد اسحاق نے ساٹھ برس لوگوں کو پڑھایا۔ مدرسہ نذیریہ کے طلباء نے ممکن ہے اُن سے کچھ سیکھا ہو۔ لیکن مولانا اسحاق کے تمام گھریلو شاگرد میری طرح کورے ہی رہے۔ میں بھی مولانا محمد اسحاق کا شاگرد ہوں اور مولانا محمد ایوب سے پہلے کا شاگرد ہوں۔

مولانا محمد ایوب تنہا شخص ہیں جنھوں نے مولانا محمد اسحاق سے پورا فیض پایا اور ایک چیز تو ایسی حاصل کرلی کہ اُس میں مولانا محمد اسحاق پر فوقیت لے گئے۔ مولانا محمد اسحاق قرآن، حدیث، فقہ سب علوم میں یکتائے روزگار تھے۔ لیکن منطق اور فلسفہ و حکمت اُن کا خاص مضمون تھا۔ منطق اور فلسفہ و حکمت کا اُنھیں اسپیشلسٹ

(specialist) کہنا چاہیے۔ مولانا محمد ایوب نے بھی منطق اور فلسفہ و حکمت میں کمال پیدا کیا ہے۔

منطقیوں کا دماغ عموماً مذہب کے خلاف جایا کرتا ہے۔ لیکن مولانا محمد اسحٰق منطق سے اسلام کی تائید کا کام لیتے تھے۔ مولانا محمد ایوب کی بھی یہی روش ہے اور اس روش پر چلنے کے مولانا محمد ایوب کو مولانا اسحٰق سے زیادہ مواقع ملے ہیں۔

مولانا محمد ایوب تیئس (23) سال کے تھے جب پہلی دفعہ حکیم علی رضا خاں کی تلاش کرتے میرے ہاں پہنچے۔ حکیم صاحب کسی مریض کو دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ اُس دن سے 1947ء تک دِلّی میں چھبیس ستائیس برس مسلسل مولانا محمد ایوب مجھ پر کرم فرماتے رہے۔

مولانا محمد ایوب جب بولتے ہیں تو گھنٹوں بولتے ہیں۔ اب ساٹھ سال سے اوپر عمر ہے۔ قریباً چالیس سال سے بول رہے ہیں اور چالیس سال میں بلامبالغہ چھ سات ہزار تقریریں کر چکے ہیں۔ مشق کا کوئی ٹھکانہ ہے۔

علمی اور دقیق مضامین ایسی عام فہم زبان میں بیان کرتے ہیں کہ بے پڑھے لکھے مسلمان اور اسلام سے ناواقف غیر مسلم سمجھ لیتے ہیں۔

دِلّی میں ایک ہندو صوفی ہیں۔ پنڈت تیلورام۔ اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں اُن کا ذکر کر چکا ہوں۔ پنڈت جی بھی مولانا محمد ایوب کی تقریریں سننے آتے تھے۔ یکایک آنا بند کر دیا۔ میں نے سبب پوچھا۔ ایمان سر کنے لگا تھا اور اس کے لیے دل تیار نہیں تھا۔

مولانا کی تقریریں سننے سے اسلام کے متعلق کوئی شک شبہ باقی نہیں رہ سکتا۔ بولنے کی طرح لکھنے کا چسکہ نہیں ہے (نوٹ از مصنف : اب

لکھنا بھی شروع کر دیا ہے) ۔ ورنہ اللہ تعالیٰ نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا سا دماغ عطا کیا تھا۔ کسی کو اپنی عقل پر گھمنڈ ہوتا تو وہ مولانا محمد ایوب کی تقریریں سُن لے ، اُسے اپنی عقل کی بے بضاعتی کا پتہ لگ جائے گا۔ مولانا محمد ایوب کی عقل کی دست رس ہر مدّعی عقل کی دست رس سے آگے ہے ۔ مولانا عقل و عرفان کے سمندر میں اُس تہہ تک پہنچ جاتے ہیں جہاں بڑے بڑے مدعیان عقل نہیں پہنچ سکتے ۔

مجھے مولانا محمد ایوب کی تقریروں سے بے حد فائدہ پہنچا ہے ۔ میں اُن کے اِس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ خواجہ حسن نظامی کے ذریعہ اللہ نے مذہب کی طرف متوجہ فرمایا تھا، مولانا محمد ایوب کی تقریریں سنوا کر ایمان مستحکم کر دیا۔ مولانا محمد ایوب مجھ سے دس برس چھوٹے ہیں، لیکن میں انھیں اپنا بزرگ سمجھتا ہوں ۔ میری تحریر میں تھوڑی

بہت کوئی بات ہے تو وہ خواجہ حسن نظامی کی پچاس سالہ ہم نشینی کا نتیجہ ہے اور کسی قدر غور و فکر کرنا مجھے آیا ہے تو مولانا محمد ایوب کی چالیس سالہ صحبت سے آیا ہے۔

مولانا محمد ایوب نے مولویت کو پیشہ نہیں بنایا ہے۔ دِلّی میں پرانی ساڑھیوں کی تجارت کرتے تھے۔ کراچی میں بھی کپڑے کی دوکان ہے۔

(1) دِلّی میں میرے علاوہ حکیم علی رضا خاں اور نواب فیض احمد خاں کے دیوان خانے میں تقریریں کیا کرتے تھے۔

(2) کراچی میں ایک اتوار بیچ جناب اسد ملتانی کے ہاں تقریریں ہوتی ہیں۔ الحمدللہ میں چالیس سال سے مسلسل یہ تقریریں سن رہا ہو۔

(از مصنف) نواب فیض احمد خاں کا دیوان خانہ حکیم اجمل خاں کے دیوان خانے کے بعد میرے زمانے کی دلّی کا سب سے اہم دیوان

خانہ تھا۔ اس میں مولانا محمد ایوب کی تقریریں ہی نہیں ہوتی تھیں، مسلمانوں کی تقدیر کے فیصلے بھی ہوتے تھے۔ نواب صاحب کے دیوان خانے کے علاوہ میں نے حکیم اجمل خاں، حکیم رضی الدین خاں، ہزہائی نس نواب سر امیر الدین احمد خاں والی لوہارو، نواب احمد سعید خاں طالب، ڈپٹی اکرام اللہ خاں، ڈپٹی ہادی حسین خاں اور نواب سلطان مرزا کے دیوان خانے دیکھے ہیں۔ حکیم واصل خاں کا دیوان خانہ بھی دیکھا ہے۔ حکیم عبد المجید کا دیوان خانہ بھی خواب سا یاد ہے۔ اور حکیم محمد احمد خاں اور حکیم غلام کبریا خاں عرف بھورے میاں کے دیوان خانے تو کل کی بات ہے۔

ہاں ایک دیوان خانہ اور تھا۔ محلہ مٹیا محل میں منشی کرم اللہ خاں عرف ننھے خاں کا دیوان خانہ۔ مولانا الطاف حسین حالی اِس دیوان خانے میں پابندی سے آتے تھے۔

تقریریں مولانا محمد ایوب میرے ہاں نواب فیض احمد خاں کے ہاں سے زیادہ کیا کرتے تھے۔ ایک عرصے تکا انھوں نے میرے ہاں مسلسل روزانہ تقریریں کی ہیں۔ لیکن میں اپنے ہاں کے اجتماع کو یا خواجہ محمد شفیع کے ہاں کی اردو مجلس والے اجتماع کو دیوان خانے کی نشست نہیں کہہ سکتا۔ میرے ہاں کا اجتماع اور اُردو مجلس کا اجتماع اپنے اپنے رنگ کے بے مثل اجتماع تھے۔ مگر دیوان خانے کی نشست نہیں تھے۔ 2۔ جناب اسد ملتانی بحیثیت شاعر اور ماہر اقبالیات کسی تعارف کے محتاج نہیں ہے۔ قدرے غیر معروف حوالہ یہ ہے کہ وہ معروف جاسوسی ناول نگار مظہر کلیم ایم اے کے خالو اور سُسر تھے۔ راقم الحروف کے سوال پہ مظہر کلیم صاحب نے کہا کہ انھوں نے اپنی ساس اور بیگم دونوں سے مولانا محمد ایوب

دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں سن رکھا ہے۔ افسوس کہ زیادہ تفصیل حاصل نہیں ہو پائی۔ از مرتب

'مولانا محمد ایوب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد اسحاق رام پوری کے شاگرد ہیں۔ مولانا محمد اسحاق نے ساٹھ برس لوگوں کو پڑھایا، مدرسہ نذیریہ کے طلبہ نے ممکن ہے ان سے کچھ سیکھا ہو، لیکن مولانا کے تمام گھریلو شاگرد میری طرح کورے رہے۔ میں بھی مولانا محمد اسحاق کا شاگرد ہوں اور مولانا محمد ایوب سے پہلے کا شاگرد ہوں۔ مولانا محمد ایوب تنہا شخص ہیں جنھوں نے مولانا محمد اسحاق سے پورا فیض حاصل کیا۔ مولانا محمد اسحاق قرآن، حدیث، فقہ سب علوم میں یکتائے روزگار تھے، لیکن منطق اور فلسفہ و حکمت ان کا خاص مضمون تھا۔ منطق اور فلسفہ و حکمت کا انھیں اسپیشلسٹ کہنا چاہیے، مولانا محمد ایوب نے بھی منطق اور فلسفہ و حکمت میں کمال پیدا کیا تھا۔ منطقیوں کا دماغ عموماً

مذہب کے خلاف جایا کرتا ہے، لیکن مولانا محمد اسحاق منطق سے اسلام کی تائید کا کام لیتے تھے۔ مولانا محمد ایوب کی بھی یہی روش ہے اور اس روش پر چلنے کے مولانا محمد ایوب کو مولانا محمد اسحاق سے زیادہ مواقع ملے ہیں۔

مولانا کی تقریریں سننے سے اسلام کے متعلق کوئی شبہ باقی نہیں رہ سکتا۔ مولانا کو بولنے کی طرح لکھنے کا چسکا نہیں ہے۔ ورنہ اللہ نے امام غزالی کا سا دماغ عطا کیا تھا۔ کسی کو اپنی عقل پر گھمنڈ ہو تو وہ مولانا محمد ایوب کی تقریریں سن لے، اسے اپنی عقل کی بے بضاعتی کا پتا لگ جائے گا۔ مولانا عقل و عمران کے سمندر میں اس تہ تک پہنچ جاتے جہاں بڑے بڑے مدعیان عقل نہیں پہنچ سکتے۔ مجھے مولانا محمد ایوب کی تقریروں سے بے حد فائدہ پہنچا ہے۔ میں ان کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ خواجہ حسن نظامی کے ذریعہ اللہ نے

مذہب کی طرف متوجہ فرمایا تھا۔ مولانا محمد ایوب کی تقریریں سنوا کر ایمان مستحکم کیا۔ مولانا محمد ایوب مجھ سے دس برس چھوٹے ہیں لیکن میں انھیں اپنا بزرگ سمجھتا ہوں۔ میری تحریر میں تھوڑی بہت کوئی بات ہے تو وہ خواجہ حسن نظامی کی پچاس سالہ ہم نشینی کا نتیجہ ہے اور کسی قدر غور و فکر کرنا آیا ہے، تو مولانا محمد ایوب رحمۃ اللہ علیہ کی چالیس سالہ صحبت سے آیا ہے۔ مولانا محمد ایوب رحمۃ اللہ علیہ نے مولویت کو پیشہ نہیں بنایا، الحمد اللہ میں چالیس سال سے مسلسل یہ تقریریں سن رہا ہوں۔

جناب مشتاق احمد یوسفی نے مولانا پر اپنے مضمون ''ایک او کھا انوکھا دکاندار'' میں تحریر کیا ہے کہ :۔

زیرِ نظر سطور مشتاق احمد یوسفی صاحب کی کتاب شام شعریاراں سے مستعار ہیں۔

فقر و استغناء کا تذکرہ مولانا محمد ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر کے بغیر ادھورا رہے گا۔ میں نے مولانا کو اپنے عزیز دوست میاں فضل حسین کے ہاں دیکھا اور گھنٹوں بڑے شوق و ادب سے سنا۔ وہ ان کے ہاں اتوار کے اتوار تشریف لاتے تھے، فضل صاحب ان کے فرمودات بڑی عقیدت اور باقاعدگی سے ریکارڈ کرتے۔ حکیم محمد سعید کے پاس بھی ان کی باتیں بیسیوں کیسٹوں میں محفوظ تھیں جن کے کچھ حصے چھپ چکے ہیں۔ دور ہو یا قریب کہیں بھی جانا ہو، میں نے مولانا کو پیدل ہی آتے جاتے اور دسمبر اور جنوری میں بھی صرف ململ ہی کے کرتے میں دیکھا۔ دقیق سے دقیق نکتے کو باتوں ہی باتوں میں بہت سہل اور سجل پیرائے میں بیان کر دیتے۔ جتنی آسانی سے وہ سمجھاتے اتنی ہی آسانی سے بات سمجھ میں آ جاتی۔ جس موضوع پر گفتگو کرتے، اس کے اختتام پر فوراً اٹھ کھڑے ہوتے۔ چائے،

مشروبات، کھانے اور کسی بھی قسم کی تواضع سے پہلے ہی بہ عجلت رخصت ہو جاتے'۔

بندر روڈ کے آخری سرے پر میری ویدرٹاور کے نزدیک مولانا کی لیدر گڈس (چمڑے کے سامان) بالخصوص سوٹ کیسوں کی دکان تھی۔ وہ صبح گیارہ بجے خود دکان کھولتے اور فروختنی اشیاء کو ڈسٹر سے جھاڑ پھونک کر ترتیب سے سجاتے۔ جیسے ہی اتنی بکری (فروخت) ہو جاتی کہ دن کا خرچ نکل آئے، وہ فوراً تالا لگا کے اپنی (beat معمول کا گشت) پر نکل جاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ پوری طرح دکان کھلنے سے پیشتر ہی بوہنی دن کی دال روٹی جوگے ہو جاتی تو وہ ڈسٹر پھینک پھانک کر دکان کا شٹر گرا دیتے! اکثر و بیشتر دو تین گھنٹے ضرور لگ جاتے۔ آج اور صرف آج کی حاجت و ضروریات سے

زیادہ بخری و منافع کے وہ طالب تھے نہ قائل۔ فقر و قناعت کی اس کٹھن روش پر درجۂ کمال تک قائم رہنا اسی حالت میں ممکن ہے کہ وہ بندے کو خیر الرازقین کی حکمت رزاقی پر کامل یقین ہو۔ ان کی عظمت و برگزیدگی کے تو سب ہی قائل تھے لیکن ان کے اہل خانہ اور لواحقین کے توکل اور نہفتہ عظمت پر شاید و باید ہی کسی کی نظر گئی ہو! سلام ہو ان پر۔

مولانا کو جب اور جہاں بھی دیکھا، ایسا ہی لگا کہ بہت جلدی میں ہیں۔ جس عاجلانہ و فقیرانہ شان سے آئے ہیں، اسی طور کہیں اور جانے کی جلدی ہے۔ مولانا نے ساری زندگی اسی وضع و نہج پر گزاری اور پایان عمر بھری بزم کو حسن سماعت میں گم چھوڑ کر جہاں جانا تھا، اسی طور شتابی چلے گئے۔

اپنے عہد کے منفرد کالم نگار اور صحافی نصر اللہ خان (مرحوم) نے مولانا پر اپنے تعزیتی کالم میں لکھا تھا کہ :۔

''اگرچہ مولوی محمد ایوب رحمۃ اللہ علیہ تابعین اور تبع تابعین کے وقت کے بہت بعد پیدا ہوئے، لیکن ان قدسی صفات بزرگوں کے حالات، کتابوں میں پڑھ کر اور مولوی صاحب کو دیکھ کر یوں لگتا ہے، جیسے مولوی صاحب انھی میں سے ہیں۔ وہی صبر و تحمل، وہی عاجزی وانکساری، وہی شان قلندری، وہی جلال، وہی جمال، وہی سادہ زندگی اور حصول اکل حلال، وہی خود تکلیفیں اٹھانا، دوسروں کا بھلا چاہنا اور ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرنا، کلام پاک کے مطالعہ سے کچھ لوگوں پر شریعت کی راہیں روشن ہوتی ہیں اور کچھ لوگوں پر طریقت کی۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن پر یہ دونوں راستے

بیک وقت روشن ہو جاتے ہیں، مولوی صاحب ان قدسی صفات بزرگوں میں سے تھے جن پر دونوں راستے روشن تھے''۔

معروف ادیب، شاعر، دانشور اور مذہبی سکالر جناب احمد جاوید صاحب نے فرائیڈے اسپیشل کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے مولانا محمد ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق ایک سوال کے جواب میں کہا کہ :

'رہی بات مولانا ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی، تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہماری روایت کے آخری متکلم تھے۔ ان کے زیادہ تر موضوعات کلامی تھے، معقولی تھے۔ اگر کبھی متکلم کی حیثیت سے ان کا جائزہ لیا گیا، تو وہ ہماری علم الکلام کی روایت میں سب سے آگے کے لوگوں میں شمار کیے جائیں گے۔ مذہبی فکر کے جو مسائل لاینحل چلے آرہے تھے ان میں ایک مسئلہ جبر و قدر تھا۔ اس طرح کے مسائل کو مولانا ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح حل کیا کہ

ان کی دشواری پڑھنے یا سننے والوں کی نظر سے غائب ہو گئی۔ عقل اپنے آپ کو پورے کا پورا ایمان کے تابع رکھنے کا ارادہ رکھنے کے باوجود اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے عاجز رہ جائے، تو جو شخص عقل کی اس نارسائی کو دور کرے گا وہ اصل میں متکلم ہو گا۔ متکلم کہتے ہی اسے ہیں جو عقل کے ایمانی کردار کو اس کے دیگر وظیفوں پر غالب رکھ کر دکھا دے۔ مولانا ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ گذشتہ سو، دو برس کی روایت میں شاید سب سے بڑا مذہبی ذہن ہیں جنھوں نے عقل کی نارسائی کا ازالہ کیا اور عقل کو ایمانی بننے کے لیے جن دلائل کی ضرورت تھی، وہ دلائل فراہم کیے۔ لیکن افسوس، چونکہ بڑے موضوعات سے ہماری مناسبت ختم ہو چکی ہے اور مولانا کے مخاطبین معمولی لوگ تھے اور اس کے بعد اس معمولی پن میں اضافہ ہوتا چلا گیا، تو اب تو نہ کسی کو جبر و قدر مشکل محسوس ہوتا ہے اور نہ

آسان۔ کیونکہ وہ اس سے واقف ہی نہیں ہے۔ اس کا یہ مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان کی تعریف و توصیف سامنے نہیں آ سکی۔ مولانا پر مجھے یہ اعتماد رہا ہے اور ہے کہ ایمانیات میں، عقل کی ہر مشکل میں، اسے قائل کرنے کی جیسی صلاحیت ان میں تھی وہ میں نے کسی کی تحریر میں دیکھی نہ تقریر میں۔ یہ ان کا امتیاز تھا۔ شخصیت کے اعتبار سے وہ بہت بڑے آدمی تھے، یعنی بلند کردار اور عمیق علم کو اگر ایک شخص میں جمع دیکھنا ہے، تو آپ مولانا ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھیں، یہ تھے مولانا ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ'۔

افسوس۔ یہ تمام باتیں مولانا ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ختم ہو گئیں، جب کہ قیام پاکستان سے پہلے بھی اور بعد میں بھی کراچی مذہب و ادب کے حوالے سے منفرد تھا۔ یہ شہر صوفیاء، علماء، بزرگان دین اور ادبا و شعراء کا مسکن تھا۔ جگہ جگہ علمی، فکری اور دینی

مجالس کا انعقاد ہوا کرتا تھا اور لوگ بلا تفریق مسلک و مذہب ان میں شریک ہوا کرتے تھے۔ یہ صورت حال ستر کی دہائی تک برقرار رہی۔ مذہبی اور غیر مذہبی انتہا پسندی بالکل نہیں تھی۔ برداشت، تحمل اور درگزر جیسے رویے عام تھے، لوگ ان رویوں سے اخلاص کے ساتھ وابستہ تھے اور انھی روایتوں کی بنا پر شہر میں امن و مان کی صورت حال قائم تھی۔ بعد میں یہ صورت حال مضمحل ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ انتہا پسندی کا عفریت ہر طرف ناچنے لگا اور اب ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے امن و امان ہی نہیں بلکہ اس شہر سے علم بھی اٹھ گیا ہے۔ اہل علم معدوم ہو گئے ہیں۔ ہر طرف ایک خوف اور بے کیفی عود کر آئی ہے۔ اے اللہ تو ہمارے شہر اور ہمارے ملک کو اپنی اصل کی طرف لوٹا دے تاکہ ہماری آئندہ نسلیں علم و اخلاق سے آراستہ ہو سکیں۔ (آمین)

❋ ❋

عزیز ابن الحسن

مولانا ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک نادرو نایاب تقریر جو لطف اللہ خان کے آواز خزانے سے محترم ڈاکٹر محمد خورشید عبداللہ کی تلاش وسعی کے نتیجے پہلی مرتبہ منظر عام پر آئی ہے۔ مولانا ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے انہیں جاننے والے منطق و کلام میں انہیں غزالئ عصر قرار دیتے ہیں۔ راقم اس قابل نہیں کہ وہ مولانا ایوب رحمۃ اللہ علیہ کے تعارف کے لئے بھی کچھ کہہ سکے، جنہیں ان کے بارے میں کچھ مزید جاننے کا شوق ہو وہ ان کے بارے میں جناب احمد جاوید کی

یوٹیوب پر دو تین گھنٹے کی گفتگو سُن سکتے ہیں۔ میں تو بس ان سے تقریبِ تعارف اور ان کے بارے میں چند تاثراتی کلمات ہی عرض کر سکتا ہوں۔ جو ان کی کچھ تحریروں اور زیرِ سماعت اس تقریر سے میں نے اخذ کیے۔

میں مولانا سے سراج منیر اور احمد جاوید کے توسط سے ۱۹۸۷ء میں مولانا کے رسالے 'جبر و قدر' کے ذریعے واقف ہوا تھا۔ رسالہ سمجھ میں تو کیا آتا البتہ دو ایک نکتے وہاں ایسے ملے جو آج تک کفایت کرتے ہیں؛ ایک یہ کہ جو مسئلہ (جیسے تقدیر) جس حال state کا ہو اسے اس حال سے باہر اگر سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو کبھی سمجھ نہیں آئے گا، تمثیل میں انہوں نے جیومیٹری کی کچھ مثالیں دیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ کے ہاں انسان کے مواخذے کا مدار اس کے

اختیارِ تمیزی کی صلاحیت پر ہے اور یہی حسِ تمیز ہی اس کی آزادی کی دلیل ہے۔ علاوہ ازیں ان کی مختلف تحریروں میں مجھے جس شے نے متاثر کیا وہ عقل کے استرداد کے بجائے اس کی محدودیت اور اس کے کسی خارجی ہدایت کے محتاج ہونے کے تصور کو بدلائل مبرہن کرنے کی انتھک توضیح ہے۔

زیرِ نظر تقریر

https://youtu.be/57Etwz--uBI?si=mtx74BH0fKWwy6DQ

میں بھی یہی عقل کی بحث ہے۔ عام تصور کے بر عکس مولانا بارِ امانت اسی عقل کو قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے یہ بات بھی بہت مزے کی کہی ہے کہ انسان نے اگر دنیاوی زندگی ہی گزارنی ہو تو پھر

یہ ایک اعتبار سے جانوروں کے مماثل ہے اور دوسرے اعتبار سے ان سے بدتر ٹھہرتا ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں جو کام جانور ہلکے پھلکے رہ کر (یعنی عقل کا اضافی بوجھ اٹھائے بغیر) باآسانی کر رہے ہیں انسان کو یہی کام کرنے کے لیے عقل کا اضافی بوجھ بھی اُٹھانا پڑ رہا ہے۔

اس بات سے مولانا عقل کے لیے کوئی ایسا وظیفہ ثابت کر رہے ہیں جو محض دنیاوی زندگی گزارنے سے زائد کسی برتر مقصد کے لیے ضروری ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عقل حُسن وقبح میں تمیز کر سکتی ہے تمیز کر کے انہیں ترک یا قبول کر سکتی ہے، مگر وہ اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکتی کہ حُسن کیا ہے، قُبح کیا ہے؟ اس کے لیے وہ ہمیشہ کسی خارجی حکم کی محتاج رہتی ہے۔ عقل کی یہ ضرورت صرف وحی سے پوری ہو سکتی ہے۔ وحی کی روشنی میں متحقق ہو چکے حُسن وقبح کو رد کرنے یا اسے قبول کرنے میں عقل پوری طرح بااختیار ہے اور اسی

اختیارِ تمیزی، بارِ امانت پر اللہ کے ہاں انسان کا مواخذہ ہو گا۔ اس پوری گفتگو میں مولانا نے ایک اور اہم نکتہ اللہ تعالیٰ کے ارادے اور اس کے امر کے مابین فرق کا بیان کیا ہے۔ کہا کہ اللہ جب کسی کام کا ارادہ کرلیتا ہے تو پھر وہ ہو کر رہتا ہے، اس کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ لیکن اللہ کے امر اور حکم کو ماننے یا نہ ماننے کا اختیار انسان کو دیا گیا ہے، اور یہ اختیار بواسطۂ عقل عمل میں آتا ہے۔

ایک آخری بات مولانا ایوب رحمۃ اللہ علیہ کے طرزِ تکلم اور لذتِ تقریر کے بارے میں۔ اب تک مولانا کے اکثر خیالات لوگوں کے سامنے تحریر (جو اصلاً ان کی تقریریں ہی ہیں) میں ہی آئے تھے۔ تحریر میں یہ باتیں قدرے مشکل اور خشک سی لگتی ہیں، مگر ان کی یہ تقریر سُن کر یکسر مختلف تاثر ملتا ہے۔ میرا گمان تھا کہ وہ شاید بہت ٹھہر ٹھہر کر قدرت سپاٹ سے بے تاثیر لہجے میں گفتگو کرتے ہوں

گے، مگر یہاں تو ایک ہموار روانی اور بہتے پانی کا سا سماں ہے، تس پہ ان کا خوش آہنگ شستہ اور دھُلا نکھرا لب و لہجہ۔ ۔ ۔

وہی باتیں جو تحریر میں مشکل نظر آتی تھیں ان کی تقریر کی لذت نے انھیں شیریں تر بنا دیا ہے۔ میرا گمان ہے کہ مولانا کہ یہ تقریر کچھ نہیں تو چالیس پنتالیس برس بعد منظر عام پر آئی ہے۔ آپ تقریر سُنیے اور ڈاکٹر خورشید عبداللہ کو دعائیں دیجیے، جو ہیں تو میڈیکل ڈاکٹر مگر اس شعر کے مصداق ہیں :۔ شفق دھنک، مہتاب گھٹائیں تارے، نغمے، بجلی، پھول

اس دامن میں کیا کیا کچھ ہے دامن ہاتھ میں آئے تو۔

بشکریہ : عزیز ابن الحسن

**

برِصغیر پاک وہند کے آخری کلاسیکی متکلم : حافظ ایوب دہلویؒ

محمد رشید ارشد

https://madrasadiscourses.org/1825/

30 ستمبر، 2020

علم الکلام کے مرکزی مباحث پر مولانا ایوب دہلویؒ نے تفصیل سے گفتگو فرما رکھی ہے، اور شاید ہی کوئی ایسا بنیادی موضوع ہوگا جس میں مولاناؒ نے پوری روایتِ کلام میں کوئی ترمیم یا اضافہ نہ کیا ہو۔ خاص طور پر وجودِ باری تعالیٰ پر عقلی استدلال کرنے کی کلامی روایت اپنے بڑے حصے میں ایک سپاٹ یکسانی کا شکار ہو چکی تھی اور اس روایت کا ایک چھوٹا حصہ جو زیادہ فعال رہا، اس میں یہ دینی / کلامی سے زیادہ عقلی / فلسفیانہ یا متجددانہ / اخلاقی بن چکے تھے۔ کلامی روایت کی اس شاخ نے سکہ بند مباحث کے تسلسل کو جاری رکھا، لیکن اس بنیاد کو عملاً ترک کر دیا جس سے علم الکلام کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ یعنی وحی کے معیاری فہم کو عقل کے لیے واجب التسلیم بنانا، ایک تقریباً مشترکہ استدلالی، منطقی اور اصطلاحی اساس پر۔ مولاناؒ تک آتے آتے ایک طرح کا تفلسف اور جدید اخلاقی نظریات اس پر حاوی آ چکے تھے۔

متقدمین نے عقلی، منطقی اصطلاحات کو فلسفے کے چنگل سے نکالنے میں جو کامیابی حاصل کی تھی، اسے متاخرین نے تقریباً ضائع کر دیا تھا۔ مولاناؒ جس زمانے میں تھے، وہاں تک پہنچتے پہنچتے علم الکلام، وحی کی مستند تعبیر اور روایتی تفہیم سے ایک بڑا فصل پیدا کر چکا تھا اور مقبول اور متداول نظریات کے ساتھ ایک جبری مطابقت اور مصنوعی قرب پیدا کرنے کے درپے ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کی معقولی روایت میں عقل کے ایمانی اور فلسفیانہ کردار میں جو کشاکش اور امتیاز پوری مضبوطی کے ساتھ چلا آرہا تھا، وہ دونوں جہتوں میں قریب قریب فنا ہو گیا تھا۔ کلام اپنی روایت کو سنبھالنے کے قابل نہ رہا اور مسلم فلسفہ اپنے منہج کو تھامے رکھنے کے قابل نہ رہ سکا۔ ایک خلا سا پیدا ہو گیا تھا جہاں دینی شعور کو پنپنے کا موقع ہی نہ رہا تھا۔ خصوصاً دینی مدافعت کے مواقع پر ایک شکست خوردہ تطبیق یا ہٹ دھرم تردید کے

سوااس وقت کی علمی روایت میں اگر کچھ رہ بھی گیا تھا تو اس کی سطح بہت کم تر تھی۔ اور ایسی دفاعی سرگرمیوں سے الٹے نتائج نکلنے شروع ہو گئے تھے۔

ہمارے یہاں سر سید سے لے کر مولانا مودودی تک شدید باہمی اختلافات کے باوجود کچھ بنیادی کمزوریاں مشترک نظر آتی ہیں۔ ان کمزوریوں کے دو عنوان اوپر عرض کر دیے ہیں۔ وجودِ باری تعالیٰ کے اثبات میں پرانے متکلمین نے عظیم الشان استدلالی structure بنائے، لیکن بہر حال ان کی ایک عمر تھی جو گزر چکی تھی۔ استدلال خواہ کتنا بھی محکم ہو، اس کا ایک سیاق و سباق ہوتا ہے جو بدلتا رہتا ہے۔ جدید برِ صغیر یعنی انگریزوں کی آمد کے بعد کا برِ صغیر ایک بالکل نیا context لے کر وجود میں آیا، اس میں وہ نظامِ

استدلال اجنبی اور غیر موثر ہو کر رہ گیا جو کبھی ایک دوسرے سیاق و سباق میں عقل کے لیے تشفی بخش ہوا کرتا تھا۔ چونکہ ہمارا مذہبی شعور فقہ سے بنا ہے اور تقلید کا عادی ہے، لہذا کلامی امور میں بھی ایسی تقلید کو کافی سمجھ لیا گیا۔ مدلولات کو بدلے بغیر استدلال میں جس تغیر اور تازگی کو جگہ ملنی چاہیے تھی، وہ نہ مل پائی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اہلِ دین کی اجتماعی عقل خود ہی عقائد سے حالتِ سیرابی میں نہیں تھی اور تسلیم کے عقلی تجربے سے نہیں گزری تھی تو وہ عقائد کے لیے دلائل کہاں سے لاتی۔

مولاناؒ نے کلامی روایت کے اصول پر ثابت قدم رہتے ہوئے اسے لاحق ہو جانے والے جمود اور خلا کو جس طرح توڑا، اس کی کوئی مثال ان کی ہم عصر اسلامی دنیا میں نظر نہیں آتی۔ مولاناؒ نے اصولِ کلام کی تجدید ہی نہیں کی بلکہ اس کے مباحث کی تدوین نو بھی کی۔ اگر وہ لکھنے

پر متوجہ ہوتے تو کچھ بعید نہ تھا کہ پورے کلامی discourse کا احیا اور تاسیس ہو جاتی۔ مثلاً انھوں نے آ کر بتایا کہ کلام کے اصل موضوعات دلائلِ توحید، دلائلِ نبوت اور دلائلِ معاد ہیں۔ گویا یہ علم الکلام کا وجودی در و بست ہے۔ اس کے بعد متکلم کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ علم کیا ہے؟ عقل کیا ہے؟ اختیار کیا ہے؟ اس سے تصورِ انسان سامنے آتا ہے اور دوسری طرف اس پر غور کرنا ضروری ہے کہ زمان و مکان کیا ہیں؟ ایمانی ذہن میں بننے والا کونیاتی کل کیسا ہوتا ہے؟ اس سے کائنات کی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ گویا مولاناؒ اپنے زمانے کی واحد آواز تھے جنھوں نے پورے شکوہ اور وضاحت کے ساتھ یہ بتایا کہ علم الکلام نام ہے خدا، انسان اور کائنات کے مبنی بر ایمان علم کا، جو عقل پر حاکم ہو۔ اگر غور کریں تو

معلوم ہوگا کہ یہی وہ تین بنیادی سوالات ہیں جن سے کسی بھی فرد کا ورلڈ ویو سامنے آتا ہے :

عالم از رنگست وبی رنگی است حق

چیست عالم چیست آدم چیست حق

مولاناؒ کے تمام کلامی مسائل پرانے ہیں مگر نئی ترتیب اور تازہ استدلال کے ساتھ۔ اس کی تفصیل ہم موضوع بہ موضوع دیکھیں گے۔

سب سے پہلے ہم علم الکلام کی تعریف اور موضوع کے حوالے سے مولاناؒ کا موقف بیان کریں گے اور پھر ان تین بڑے سوالات کے حوالے سے بطور مثال ایک ایک موضوع کو لے کر اس پر مولاناؒ کی رائے نقل کریں گے، حق یا ذاتِ حق کے مبحث میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر مولانا کی رائے بیان کی جائے گی، آدم کیا ہے؟

کے سوال پر انسانی عقل اور علم کو جس طرح مولاناؒ دیکھتے ہیں، اس کا تعارف کرایا جائے گا، اور چیست عالم، یعنی کونیاتی دائرے میں مسئلہ زمان پر مولاناؒ کی گفتگو مثال کے طور پر پیش کی جائے گی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ہم یہ دیکھ لیں کہ مولاناؒ علم الکلام کی کیا تعریف کرتے ہیں، کیونکہ ہر علم پہلے قدم پر خود کو define کرتا ہے اور اسی تعریفی دائرے میں اس کی بنیادی یا ثانوی مباحث اور مناہج استدلال پیدا ہوتے ہیں۔ متوسطین میں علم الکلام کی طرح طرح سے تعریف وضع کی گئی ہے۔ مولاناؒ نے ان تمام تعریفات کا ایک فقرے میں خلاصہ کر دیا ''علم کلام کی تعریف متکلمین نے یہ کی ہے کہ علم کلام وہ علم ہے کہ جس سے دلائل کے ذریعہ عقائدِ دینیہ کے اثبات پر اور ان (عقائد) پر جو شبہات ہوں، ان

شبہات کے ابطال پر قدرت حاصل ہو جائے ''(۲)۔ اسی طرح علم کلام کا موضوع کیا ہے؟ اس پر بھی متکلمین کی آراء کا ایک انبار ہے، مثلاً علم کلام کا اصل موضوع: ذات و صفاتِ الٰہیہ ہیں +وجود ہے +ذہن ہے + عقل ہے + حقیقت و صورت کا ربط ہے وغیرہ۔

مولاناؒ اس منتشر ڈھیر کو مربوط کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''اگر کلام سے متاخرین کا کلام مراد ہے جس میں امورِ عامہ، طبیعات اور ما بعد الطبیعیات یعنی علمِ الٰہی کلی بالمعنی الاعم اور بالمعنی الاخص اور منطق وغیرہ سب شامل ہیں، تب علم کلام کی تعریف یہ ہونی چاہیے کہ علم کلام وہ علم ہے جس میں عقیدہ کے احوال پر اس کے حق و باطل ہونے کی حیثیت سے بحث کی جاتی ہے اور اگر متقدمین کا علم کلام مراد ہے تو پھر علم کلام وہ علم ہے جس میں عقائدِ اسلام سے عقل کے مطابق بحث کی جاتی ہے۔ اور موضوع کلام پہلی صورت میں عقیدہ

ہے حق و باطل ہونے کی حیثیت سے ، اور دوسری صورت میں عقائدِ اسلامی ہے۔

کسی علم کی تعریف اور موضوع متعین ہو جائے تو پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کی غایت کیا ہے ؟ اس بارے میں بھی ظاہر ہے تقریباً ہر متکلم نے کلام کیا ہوگا۔ مولاناؒ نے علم کلام کی بنیادی غرض اور مقصود جو بتایا ہے ، وہ تاریخ کلام میں کہیں اور بیان نہیں ہوا۔ وہ فرماتے ہیں کہ علم الکلام کی غایت یہ ہے کہ عقل کو کلام اللہ سے مانوس اور اس کے تابع کر دیا جائے ، اس کے بدلتے ہوئے احوال کے ساتھ۔ یعنی الکلام دراصل کلام الٰہی ہے۔ مولاناؒ سے پہلے غالباً کسی متکلم نے علم کلام کی حقیقت اور غایت کو بیان کرتے ہوئے اس نکتے تک رسائی حاصل نہیں کی کہ ایک تو عقل اپنے عملی تناظرات میں متغیر ہے اور دوسرے یہ کہ اس کی ایک حالتِ تسلیم و

انفعال ہوتی ہے جسے سلبی طریقے سے بر سرِ کار لایا جا سکتا ہے۔ یعنی عقل کی فعلیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے استدلال کو اگر بودا ثابت کر دیا جائے تو اس کا جوہرِ انفعال ابھر کر سامنے آ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا مبحث الٰہیات کا بنیادی موضوع ہے۔ ہماری روایت میں اس سلسلے میں مختلف آراء بلکہ عقائد پائے جاتے ہیں جن کی بنیاد پر کلام اور تصوف کے کچھ مکاتب فکر پیدا ہوئے۔ صوفیاء کے ہاں ذاتِ باری تعالیٰ اور وجودِ باری تعالیٰ میں فرق ہے، جبکہ متکلمین اس فرق کو روا نہیں رکھتے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ کلام چونکہ عقل کو الٰہی حقائق سے مانوس کرنے کا نام ہے اور عقل کی ساری ساخت ایسی ہے کہ وہ وجود و موجود یا وجود و ذات میں فرق کو اپنی تمام تجریدی صلاحیتوں کے باوجود محسوس نہیں کر سکتی، اسی لئے اہلِ کلام ذات اور وجود میں کوئی ایسی تفریق نہیں کرتے جیسے

معقول نہ بنایا جا سکے۔ روایتِ کلام میں ایک پہلو سے تو یہ بحث کی گئی ہے کہ ذات و صفات کا باہمی تعلق کیا ہے، تاہم متکلمین کا تفصیلی موضوع صفاتِ الٰہیہ ہیں۔ اپنی روایت کے مزاج کے مطابق مولانا ایوب دہلویؒ نے ذات و صفات کی باہمی نسبت پر گفتگو تو فرمائی ہے مگر سرسری۔ متقدمینِ کلام کی طرح ان کا موردِ توجہ بھی تحقیقِ صفات ہے۔ ہمارے علم کی حد تک صفاتِ الٰہیہ پر ایسا کلام جو عقل کے لئے واجب التسلیم اور شریعت کے لئے قابلِ قبول ہو، کلامی روایت کے بہترین حصے میں بھی کم ہی نظر آتا ہے۔ مولاناؒ کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے نمونے کے طور پر تین چار صفاتِ الٰہیہ کا تحقیقی تجزیہ کیا ہے جس سے برآمد ہونے والے نتائج ٹھیٹھ شرعی ذہن کے لیے بھی رہنمائی کا کام کرتے ہیں اور خالص عقل پر تکیہ کرنے والوں کے لئے بھی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔ شرع و عقل

میں حفظِ مراتب کے ساتھ ایسا توازن اور ایسی جامعیت جدید علمِ کلام میں سرے سے غائب ہے اور پرانے میں بھی کمیاب ہے۔ دینی استناد اور عقلی استدلال، دونوں کو ان کی بہترین اور محکم ترین حالتوں کے ساتھ یک جان رکھنے یا کر دینے کا جیسا ملکہ مولاناؒ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے وہ واقعتاً ایک نادر و نایاب وصف ہے اور کم از کم پچھلے سو دو سو برس کی دینی، علمی روایت میں اس کی نظیر بہت ہی کم ملتی ہے۔

مولانا ایوبؒ ذات و صفات کی عینیت و غیریت کے مباحث کو لگتا ہے کہ زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ان کا دائرہ تفکر صفات کے گرد بنتا ہے۔ صفات کیا ہیں؟ ذات کے لوازم، جو ذات کے ساتھ اعتباری امتیاز اور وجودی عینیت رکھتے ہیں۔ صفات کی معرفت کا بنیادی اصول کیا ہے؟ اس ذات کی معرفت جس سے یہ صفات منسوب ہیں۔

یہ مولاناؒ کا اصل موضوع ہے۔ مولاناؒ چونکہ صفات کو ذات کے ملزومات مانتے ہیں، اس لئے صفاتِ باری تعالیٰ پر گفتگو کرتے ہوئے وہ تحقیق و تحقق کی اساس ذاتِ باری تعالیٰ پر رکھتے ہیں۔ یعنی صفات کا مادہ معنی، وجودِ حق یا ذاتِ حق کو بناتے ہیں۔ کسی بھی صفت پر کلام کرتے ہوئے مولاناؒ کی مستقل ترتیب یہ ہے کہ پہلے وجودِ باری تعالیٰ کا حقیقی امتیاز اور یکتائی پر بات کرتے ہیں اور پھر اسے اپنی واحد سند بنا کر صفاتِ باری تعالیٰ کے حقائق و مراتب کی تحقیق کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وجود بمعنی امرِ عام کو لے کر اس کی تشقیق کرتے ہیں اور پھر اس کے معروف اقسام کو بیان کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد جا کر صفات کے حقائق کھولتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں، ''کائنات میں جتنے وجود ہیں، سب اعتباری ہیں۔ یعنی کسی نہ کسی اعتبار پر موقوف ہیں۔ اگر ان اعتبارات سے قطعِ نظر کر لی

جائے تو یہ لاشے محض ہو جائیں گے۔۔۔ تو ایسی شے جو کسی نہ کسی اعتبار پر موقوف ہو، اس کو ممکن کہتے ہیں اور کسی اعتبار پر موقوف نہ ہو تو اس کو واجب الوجود کہتے ہیں۔۔۔ وہی خدا ہے'' (۴)۔

واجب الوجود پر وہ شرائطِ ہستی وارد نہیں کیے جا سکتے جن کے بغیر ممکنات کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح واجب الوجود اور اس کے صفات و اوصاف کے درمیان پائی جانے والی لازمی نسبت بھی ویسی نہیں ہو سکتی جیسی کہ ممکن الوجود اور اس کے اوصاف و صفات میں کارفرما ہے۔ واجب الوجود کے لئے کوئی عدمی اور تعطیلی (suspended) حالت تجویز کرنا ذات کی سطح پر بھی محال ہے اور صفات کے درجے میں بھی باطل۔ موجودہ اصطلاحات میں دیکھا جائے تو واجب الوجود وہ بااختیار اور صاحبِ قدرت ذات ہے جو

کسی علت کا معلول ہے نہ کسی معلول کی علت۔ لیکن اس کا اعتبار قائم ہوئے بغیر علت بھی معدوم محض ہے اور ظاہر ہے کہ معلول بھی۔ یعنی زمانیت اور مکانیت سے ماورائی کی شان کا تقاضا ہے کہ ذاتِ حق کی صفات کو بھی ممکنات کی ان لازمی شرطوں سے مافوق اور غیر متاثر مانا جائے۔ مولاناؒ کے کلامی تناظر میں صفات کا مادہ معنی چونکہ ذات ہے، لہذا ان میں وہ اصول وحدت ظاہری تنوع اور باہمی امتیازات میں بھی پوری طرح برقرار رہتا ہے جو شے کو تضاد کے اس قاعدے سے بلند رکھتا ہے جو ممکنات میں زمانی، مکانی ہونے کی وجہ سے جاری ہے۔ مثلاً آدمی بیک آن عالم، جاہل، قادر، مجبور، اور نیک و بد ہو سکتا ہے کیوں کہ یہ ممکنات کی ماہیت اور خاصّہ ہے کہ ان میں پایا جانے والا ہر وصف ایک متوازی ضد (opposite)

ضرور رکھتا ہو گا۔ مولاناؒ نے کہا بھی ہے کہ آدمی کا قادر ہونا ہی اس کے عاجز ہونے کی دلیل ہے۔ ممکنات کے اس وجودی اور شعوری در و بست کو اگر واجب الوجود پر منطبق کیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سوالات اور جوابات دونوں بے اصل ہوں گے۔ مولاناؒ کا یہی اصرار ہے کہ واجب الوجود کی صحیح تعریف کو پیش نظر نہ رکھا جائے تو صفات باری تعالیٰ کے بارے میں کوئی درست بات ممکن ہی نہیں ہے۔

کسی زمانے میں یہ سوالات بڑی شہرت رکھتے تھے کہ کیا اللہ تعالیٰ اپنا مثل بنا سکتا ہے؟ کیا وہ کوئی ایسا پتھر تخلیق کر سکتا ہے جسے وہ خود نہ اٹھا سکے؟ کیا خدا کذب پر قادر ہے؟ اور کیا وہ محال پر تصرف کر سکتا ہے؟ وغیرہ۔ تاریخِ کلام سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ ان سوالات پر بہت سنجیدگی سے بحثیں کی گئی ہیں اور عجیب و غریب جوابات تیار

کیے گئے ہیں۔ مولاناؒ نے گویا ایسی چیزوں کو دیکھنے کا تناظر ہی بدل دیا اور بہت وضاحت اور قطعیت کے ساتھ دکھا دیا کہ ایسے تمام مباحث مہمل ہیں اور اس طرح کے لایعنی سوالات کو قابلِ جواب سمجھ کر کی جانے والی گفتگو بے سروپا ہے۔ غلط سوال کا صرف ایک جواب ہے کہ اپنے سوال کو صحیح کرو۔ ایسے ہی ایک نمونے کے طور پر مولاناؒ کی ایک بات بیان کرنی مناسب معلوم ہوتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ ممکن الوجود کا خاصہ ہے کہ وہ قادر و مقدور ساتھ ساتھ ہے۔ واجب الوجود قدرتِ امکانی نہیں قدرتِ مطلق کے ساتھ قادر ہے، اور مطلق وہی ہے جو اپنے غیر سے متاثر نہ ہو۔ یعنی قادرِ مطلق، مقدور ہو ہی نہیں سکتا، یہ محال ہے، شرعاً بھی اور عقلاً بھی۔ اس طرح کے سوالات اگر شرارت سے نہ اٹھائے جائیں تو بھی ان کی بنیاد جہلِ

مرکب(compound ignorance)پر ہے۔ مولاناؒ کے بتائے ہوئے اس نکتے سے ہی ذات و صفاتِ الٰہیہ کے حقائق سے عقل کو مانوس کرنے کے تمام راستے کھل جاتے ہیں اور کمال معرفت اگر حاصل نہ ہو سکے تو بھی ذہن غلطی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ مولانا ایوب صاحبؒ کی نظر میں اللہ تعالیٰ کے وجود و صفات کے تمام مباحث تین صفات کے اثبات پر موقوف ہیں : قدرت، علم اور خلاقی۔ تمام معلوم صفات انہی ستونوں پر بنی ہوئی عمارتوں کی طرح ہیں۔ اگر ان تینوں کی درست معرفت عقل کو میسر آ جائے تو خدا کو ماننے میں کوئی مانع نہیں رہ جائے گا۔ قدرت، یعنی قدرتِ مطلقہ کی تعریف یہ ہے کہ وہ سبب، باعث اور علت سے پاک ہو۔ مولاناؒ کے لفظوں میں 'اللہ تبارک و تعالیٰ کی قدرت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی

بیرونی وجہ ہو تو فعل کرے یا کوئی بیرونی وجہ ہو تو ترکِ فعل کرے۔ تو قادرِ مطلق کے یہ معنی ہیں کہ بلا سبب، بلا باعث، بلا علت اس کا فعل سرزد ہو۔ اس کے ساتھ ہی مولاناؒ ایک اور نکتہ بھی تعلیم کرتے ہیں کہ، ''اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ سوال کرنا غلط ہے کہ عالم ہے یا جاہل، قادر ہے یا عاجز۔۔۔ یہ تقسیم غلط ہے۔ یہ تقسیم ممکن کی ہے (یعنی واجب کی نہیں۔ اسی کی مزید توضیح کرتے ہوئے مولاناؒ فرماتے ہیں، ''اللہ کی ہر فعل کے اندر فعل اور ترکِ فعل دونوں موجود ہیں تو اللہ تعالیٰ تارک اور فاعل ہے۔ اور جو فاعل اور تارک ہے، وہی قادر ہے تو اللہ تعالیٰ قادر ہے۔ اس سے زیادہ واضح دلیل نہیں ہو سکتی کہ اللہ فعل بھی کر رہا ہے اور ترک فعل بھی کر رہا ہے۔ حیات کے وقت ممات نہیں ہوگی اور ممات کے وقت حیات نہیں ہوگی۔ اللہ پاک

دونوں متضاد چیزوں کا خالق ہے اور قادر ہی ہوگا۔ غیر قادر نہیں ہو سکتا۔''

اس میں آخری نکتہ بہت قابلِ توجہ ہے کہ قادرِ مطلق وہی ہے جو خالقِ تضادات بھی ہو۔ اس کی ضروری شرح یہ ہے کہ وجود و عدم کے قطبین میں واقع عالمِ امکان اپنے تمام اجزا میں تضادات کا حامل ہے۔ کائنات میں کوئی شے بھی اپنے ضد (opposite) سے مستغنی نہیں ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تضاد ہی ممکنات کے لیے بِنائے وجود ہے۔ اب جس نے تضادات سے بنی ہوئی یہ کائنات خلق کی ہے، وہ یقیناً واجب الوجود ہے، خود ماورائے تضادات ہے، تضادات کی جدلیت پر متصرف ہے اور قادرِ مطلق ہے، جس کی قدرتِ مطلقہ، خود اپنا ضد (opposite) نہیں رکھتی۔

دوسرے پہلو سے اطلاق کا متضاد تقیید ہے۔ جس طرح اطلاق میں وحدت اور کلیت ضروری ہے، اسی طرح تقیید کے لیے بھی کثرت اور تضاد لازمی ہے۔ اطلاق، تقیید کا سبب نہیں ہوتا یا اس کا متوازی حوالہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کا خالق اور اس پر قادر ہوتا ہے جس کے معنی کو بطریقِ سلب ہی شعور میں لایا جا سکتا ہے۔ طریقِ سلب سے مراد ہے ممکنات کے تمام وجودی حدود و خواص کی نفی کرتے ہوئے۔ عالمِ کثرت میں ہر شے اضافی اور اعتباری ہے، زندگی بھی، موت بھی، قدرت بھی، بے اختیاری بھی وغیرہ۔ یہاں پر ایجابی صفت کا قوام معنی سلبی ہے یعنی علم کے معنی میں جہل لازماً داخل ہے، بصارت کے معنی میں نابینائی حتماً شامل ہے وغیرہ۔ یہاں قدرت کا اپنے سادہ معنی اور ایجابی مفہوم میں پایا جانا محال ہے۔ اس پر وہی قادر ہو سکتا ہے جو اس کا خالق بھی ہو اور اس کا ایسا علم بھی رکھتا ہو جو

ہمہ گیر اور مطلق (Binding) بھی ہو۔ گویا قدرتِ مطلقہ، ذات واجب الوجوب کی ایسی صفت ہے جس میں خلق اور علم دونوں شاملِ حال ہیں۔ یہ اصول سہ گانہ گوکہ ہماری کلامی روایت میں جا بجا بیان ہوا ہے لیکن اس میں کائنات کی مبنی بر تضاد جدلیت کو استدلال کی کافی بنیاد بنانے کا راستہ مولاناؒ نے نکالا۔

علم کلام کو اپنے جواز اور قیام کے لئے غالباً فلسفے سے بھی زیادہ ضرورت ہے کہ وہ عقل کی تعریف کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس علم کا انحصار ہی عقل کے تصور پر ہے جس میں ایک طرف تو عقل اپنی کلیت کے ساتھ پہچان لی جائے اور دوسری جانب وحی کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت اور ضرورت واضح ہو جائے۔ مولاناؒ نے روایتی متکلمین کی طرح عقل کی حقیقت، ماہیت اور غایت پر

بہت کلام کیا ہے۔ اور اکثر مقامات پر عقل کی روایتی تعریف کو اس طرح بدلا ہے کہ عقل سے متعلق جدید فلسفیانہ اور نفسیاتی تصورات بھی عقل کی کلامی تعریف سے باہر نہیں رہ جاتے۔ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ متاخرینِ کلام میں کسی نے عقل کی واقعی ماہیت اور دینی حیثیت پر ایسی گفتگو نہیں کی جو مولاناؒ کے ہاں نظر آتی ہے۔ عقل کے سلسلے میں انہوں نے ایسے مباحث اٹھائے اور ان سے ایسے نتائج نکالے جو ہماری کلامی روایت میں ایک بامعنی اضافے کا باعث بنے۔ مولانا رحمۃ اللہ مغربی فلسفے سے بالکل واقف نہ تھے، انہیں مغربی نظریاتِ علم و عقل سے کوئی واقفیت نہ تھی، لیکن اس کے باوجود وہ علم، عقل وغیرہ ایسے بنیادی مباحث میں ایسی جگہ پر پہنچ جاتے ہیں جس کے آثار جدید نظریہ علم اور تصورِ عقل میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر، مولاناؒ عقل کو کل شعور نہیں مانتے۔ یہ

وہ نکتہ ہے جو شعور انسانی میں تحقیق کرنے والی بڑی روایتوں میں مسلّمے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اسی طرح مولاناؒ انسانی وجود کے تمام مفادات کو عقل پر منحصر نہیں سمجھتے بلکہ عقل کو ایک اچھی زندگی گزارنے کے لئے اتنا ناگزیر نہیں جانتے جتنا کہ اسے سمجھ لیا گیا ہے۔ تاہم شعور اور ارادے کے جن دائروں میں عقل کو خلقتاً مرکزیت حاصل ہے، مولاناؒ اس کا اثبات کرتے ہیں۔ اور انہی دائروں میں وحی اور عقل کے درمیان مطلوب نسبتوں کو دریافت کرنے اور انہیں فعال بنانے کی کاوشیں کرتے ہیں۔

عقل کی روایتی تعریف جس پر فلاسفہ اور متکلمین کی اکثریت متفق ہے، وہ یہ ہے کہ: عقل وہ قوت ہے جو حسن و قبح میں تمیز کرے۔ یہ حسن و قبح، حق و باطل بھی ہے، خیر و شر بھی ہے اور خوبصورت اور بدصورت بھی۔ لیکن مولاناؒ اس تعریف کو ناقص کہتے ہیں اور اس کے

مقابلے میں عقل کو اس طرح define کرتے ہیں ''دراصل عقل وہ شے ہے جو مخاطب رب العالمین ہے۔'' مولاناؒ کے نزدیک خطابِ الٰہی کا مخاطب بننے کی صلاحیت، عقل کے سوا کسی اور میں نہیں۔ یہاں مولاناؒ عقل کی اساس کو، یعنی وہ چیز جس پر عقل کے تمام افعال کا دارومدار ہے، اسے دریافت کرتے ہوئے ایک ایسا اصول بتاتے ہیں جس کا بیان پہلے نہیں ملتا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عقل کا پہلا اصول یا مبدا فعل، نفی اور اثبات ہے۔ یعنی 'ہونا' اور 'نہ ہونا'۔ عقل ہستی اور نیستی کے ان قطبین کے اندر رہتے ہوئے اپنے سارے کام انجام دیتی ہے۔ عقل سے پیدا ہونے والے تمام علوم، اور ادراک کی ساری حالتیں، اسی جدلیاتی صورتِ حال کے اندر اندر ہوتی ہیں۔ عقل کے تمام حقائق و احکام 'ہونے' اور 'نہ ہونے'

کے تعین پر مبنی ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے عقل کا پہلا مسلّمہ ہے کہ نقیضین کا اجتماع بھی محال ہے اور ارتفاع بھی۔ یعنی ''نہ تو یہ ممکن ہے کہ ایک شے ہو بھی اور نہ ہو بھی اور نہ یہ ممکن ہے کہ نہ تو وہ ہو اور نہ وہ نہ ہو" (۹)۔ عقل کا ملکہ نفی و اثبات جو اس کے ہر موقف کی بنیاد اور منتہا ہے، وہ 'ہونے' اور 'نہ ہونے' کی اسی تقسیم پر قائم ہے۔ اسی طرح ہونے اور نہ ہونے کے لوازم بھی ایک شے میں ایک لمحے میں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اس سلسلے کو اب جہاں تک بڑھاتے چلے جائیں، نتیجہ یہی نکلے گا کہ عقل کا پورا کارخانہ نفی اور اثبات کے قانون پر چل رہا ہے۔

یہاں سے مولاناؒ ایک بہت دقیق نکتہ برآمد کرتے ہیں جسے پیشِ نظر رکھا جائے تو بہت سارے مسائل خودبخود حل ہو جاتے ہیں۔ عقل میں نقیضین کی جدلیت کا نظام صرف مخلوقات اور ممکنات کے دائرے

میں کارفرما ہے یا ہو سکتا ہے۔ اگر یہی جوہرِ تعقل الٰہیات میں بھی استعمال ہونے لگے تو علم کی تشکیل کے امکانات فنا ہو جائیں گے۔ جیسا کہ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ''عقل سے یہ غلطی ہوئی کہ غیر ممکن کو بھی ممکن میں شامل کر لیا اور شامل کر کے خدا کے احکام میں تشقیق (اقسام بندی) کو جاری کر دیا۔ خدا قادر ہے یا نہیں ہے۔ عالم ہے یا نہیں ہے۔ حسین ہے یا نہیں ہے۔ یہ وہ غلطی ہے جس نے عقل کو واجب الوجود کے حقائق اور معارف سے نامانوس کر دیا۔ جو صلاحیت نظام امکان کو سمجھنے کے لئے مختص تھی، اسے نظام وجوب کی معرفت میں رہنما بنا کر جو نتائج نکلے، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ممکن کے علم کی بھی تشکیل غلط بنیادوں اور اور غلط رخ پر ہو گئی، یعنی حقائق ممکنات اوجھل رہ گئے۔ اور اسی طرح واجب کی معرفت بھی ممکن کے نمونے پر تصور کر لی گئی اور یوں حقائق الٰہیہ اور عقل کے درمیان

ایک ایسا فصل پیدا ہو گیا جس کا ازالہ کرنا عقل کی تردید اور تحدید کے بغیر ممکن نہ رہا۔'' یہاں مولاناؒ کہتے ہیں ''عقل کی حد صرف ممکنات میں ہے اور واجبات میں عقل جاری نہیں ہو سکتی کیونکہ یہاں قانونِ عقل یعنی حصر کا قانون لازم نہیں ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ محال پر قادر ہے یا نہیں ہے، اس کا کچھ جواب نہیں، علما اور حکما نہیں دے سکتے۔''

اپنے اس استدلال کو آگے بڑھاتے ہوئے مولاناؒ نے ایک ایسی عقلی اور علمی مشکل کو حل کیا ہے جو تقریباً لاینحل چلی آ رہی تھی۔ اللہ محال پر قادر ہے یا نہیں؟ یہ سوال ہی غلط ہے۔ اس کا جواب ڈھونڈنے کی بجائے سوال کو ٹھیک کرنا چاہیے۔ مولاناؒ کہتے ہیں کہ ''اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ محال پر قادر ہے تو محال مقدور ہو گیا۔ یعنی محال کے ساتھ قدرت متعلق ہوئی۔ اور یہ تعریف ممکن کی ہے۔ جس

شے کے ساتھ قدرت متعلق ہو تو اسی شے کو ممکن کہتے ہیں۔ تو اگر اللہ تعالیٰ محال پر قادر ہے تو محال ممکن ہو گیا''۔ اصل میں یہ جدلیاتی تقسیم ہی غلط ہے۔ یہ ممکنات کے دائرے میں تو کارگر بلکہ ناگزیر ہے لیکن الٰہیات میں اسے داخل کرنا بڑی غلطی ہے۔ کیونکہ واجب کا تو صرف 'ہونا' ہی ضروری ہے، وہاں 'نہ ہونے' کی جہت تصور نہیں کی جا سکتی، اور عقل کی یہ مجبوری ہے کہ وہ ہاں اور نہیں کے تقابل سے بننے والے ماحول کے باہر حرکت کر ہی نہیں سکتی۔ اسی لئے مولاناؒ کا اصرار ہے کہ ''عقل کا استعمال صرف ممکنات میں ہو گا۔ واجبات میں نہیں ہو گا''۔ عقل جب بھی واجب الوجود کی اقلیم میں داخل ہونے کی کوشش کرے گی، غلطی اور حیرانی کے سوا کچھ نہ پائے گی۔

مولانا ایوب دہلویؒ کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی روایت میں غالباً پہلی مرتبہ عقل کے ایسے حدود دکھا دیے جن پر نظر کرنے سے عقل اور زمانے کا جبری اور لزومی تعلق سامنے آ جاتا ہے۔ زمانیت (temporality) عقل کا خمیر ہے اور یہ وجود فی الزمان (Being in Time) کے سوا کسی امر کو اپنا موضوع نہیں بنا سکتی۔ یہ بات مولاناؒ سے پہلے بلکہ ان کے بعد بھی کلام کی روایت میں اپنا اتنا مرکزی کردار نہیں رکھتی۔ مولاناؒ جب یہ کہتے ہیں کہ عقل کا میدان ممکنات کے باہر نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عقل یعنی شعورِ زمانی، وجود زمانی سے خود کو بلند یا لاتعلق نہیں کر سکتا۔ عقل کے ایسے مسلمات بھی جو اپنی ماہیت میں مابعد الطبیعی یا غیر زمانی ہیں، وہ عقل کی مجبوری یا انفعال سے اس کی

دسترس میں آئے ہیں، ان کے حصول یا تشکیل میں عقل کا کوئی فعال کردار نہیں ہے۔ یہاں سے ایک نیا نکتہ یہ نکلتا ہے کہ عقلِ منفعل، عقلِ محض کی تعریف سے خارج ہے۔ یعنی اس کے انفعالی تصورات قابلِ شناخت اور لائقِ استدلال ہونے کے باوجود عقلی نہیں کہلا سکتے۔ یہ وہ باریکی ہے جس تک عقل کے دینی کردار اور ایمانی رول پر اصرار کرنے والوں کی نگاہ نہیں پہنچی۔ دوسرے لفظوں میں مولاناؒ یہ نہیں کہہ رہے کہ عقل واجب الوجود یعنی وجودِ لازمانی کا اقرار نہیں کر سکتی کیوں کہ واجب الوجود کا اقرار کرنے کی اہلیت نہ ہو تو ممکن الوجود کا ادراک بھی محال ہو جائے گا۔ اس کی کچھ ضروری تفصیل یہ ہے کہ ممکن الوجود کی اصل حالت اس کا عارضی اور مخلوق ہونا ہے۔ اس حالت کو دریافت نہیں کیا جا سکتا جب تک یہ معرفت حاصل نہ ہو کہ یہ وجودی عارضی پن اور مخلوقیت ایک مطلق امر ہے جو ممکنات

میں کہیں باہر سے وارد کیا گیا ہے۔ یہ باہر ہی دائرہ وجوب ہے جو امکان کے دائرے سے ماورائی کی حالت میں کامل اختیار کے ساتھ متعلق ہے اور اس پر من کل الوجوہ متصرف ہے۔ مولاناؒ کا مطلب یہ ہے کہ عقل واجب الوجود بلکہ غیر زمانیت کے کسی درجے پر بھی غور کرنے کی اہل نہیں ہے۔ یہ غور کرنا ہی دراصل پوری عقل ہے۔ یہ غور ہی ہے جو عقل کو شے پر غالب آنے کا راستہ دکھاتا ہے۔ اپنے موضوع پر غلبے کی یہ عادت ظاہر ہے کہ واجب الوجود اور متعلقہ حقائق پر کارآمد نہیں ہو سکتی۔

مولاناؒ کے تصورِ عقل کا ایک پہلو یہ ہے کہ عقل چونکہ فعل کے اصول پر چلتی ہے لہذا یہ ارادی بھی ہے۔ اس کا فعال ہونا اس کے ارادی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ گوکہ وہ ارادہ جو عقل کے لئے محرکِ فعل ہے، عقل سے ایسی مغائرت نہیں رکھتا کہ اس کے وجود کو عقل

کے خارج میں ماننا ضروری ہو جائے، لیکن اس ارادے اور عقل میں ایسی عینیت بھی نہیں پائی جاتی جو انہیں ایک کہنے کی وجہ بن سکے۔ عقل کو تحریک فراہم کرنے والا ارادہ غیر عقلی بھی ہو سکتا ہے۔

یہاں ارادہ و عقل کی باہمی نسبتوں کی تفصیل کا موقع نہیں ہے، ہم تو بس اتنا دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مولاناؒ نے عقل کے تابعِ ارادہ ہونے کی حالت کو کس طرح اس کی تحدید و تعیین اور تعریف کا حصہ بنایا۔ مولاناؒ کی بہت سی باتیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ عقل کو ارادی کہہ کر وہ دراصل عقل کا کوئی اندرونی تجزیہ کرنے سے زیادہ یہ ثابت کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں کہ شعور ارادی واجب الوجود اور اس کے حقائق کے ساتھ مناسبت کی بے شمار اقسام میں سے کوئی ایک قسم بھی اپنے اندر نہیں رکھتا۔ شعور ارادی اور واجب الوجود کی تحقیق کے درمیان مطلق غیریت ہے۔ یعنی غور کرنے والی عقل

اپنی ماہیت ہی میں ان حقائق سے کوئی نسبت پیدا نہیں کر سکتی جو زمانیت کی شرط سے پاک ہیں۔ عقل اور ان حقائق کے درمیان فہم و قبول کی نسبت ضرور ہے، لیکن غور و فکر کی نہیں۔ یہ بہت قیمتی بات ہے اور اسے مذہبی اور مابعد الطبیعی سیاق و سباق سے نکال کر بھی دیکھا جائے تو اس میں کوئی غلطی نظر نہیں آتی۔ غیر مذہبی تناظر میں بھی عقل، مسلمات کو قبول کرتی ہے، وضع نہیں کرتی۔

علم الکلام کی مجموعی روایت میں عقل کو حقائق پر درست استدلال کرنے کی قوت مانا جاتا ہے۔ تاہم مولاناؒ اس کا بالکل انکار کیے بغیر اسے جوں کا توں تسلیم بھی نہیں کرتے۔ ان کے مطابق عقل یقیناً اپنے مسلمات پر استدلال کرتی ہے لیکن اس استدلال کی صحت کے لئے خود معیار نہیں ہے، بلکہ اپنے غیر کی محتاج ہے۔ یہ غیر مابعد الطبیعی امور میں وحی ہے، اور طبیعی معاملات میں حس۔ وحی سند نہ

فراہم کرے تو حقائق پر استدلال گویا خلا میں چلا جاتا ہے۔ اور حس کی تائید کے بغیر صورتوں کے علم کی تشکیل نہیں ہو سکتی۔ یہ سامنے کی بات ہے کہ عقل تصور سازی کی غیر محدود صلاحیت رکھنے کے باوجود اپنے تمام تصورات کی تصدیق میں سرے سے خود کفیل نہیں ہے۔ تصدیق کا سارا نظام عقل کے باہر چل رہا ہے، اور عقل کو اس کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ اس نظام تصدیق کے دو اصولی دائرے ہیں: عقائد اور محسوسات۔ نہ عقائد عقل پر منحصر ہیں، نہ ہی محسوسات۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ مولانا عقل کو وحی اور محسوسات کے درمیان ایک فعال برزخ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، جو ان دو کناروں کو ایک دوسرے میں ضم نہ ہونے دے تو اصولاً درست موقف پر رہتی ہے لیکن ان دونوں کے امتیاز کی حفاظت اور رعایت نہ کر سکے تو ہر قدم پر

غلطی کرتی ہے۔ یہ غلطی عقائد میں بھی ہوتی ہے اور محسوسات میں بھی۔

عقل کی طرح علم میں بھی مولاناؒ کا زاویہ تفکر وجودی ہے، ذہنی نہیں۔ عقل کے بارے میں فرمایا تھا کہ 'ہونے' اور 'نہ ہونے' کے ٹکراؤ اور تضاد کے ماحول میں حرکت کرنے والی قوت ہے، اسی طرح علم کے متعلق مولاناؒ کی رائے یہ ہے کہ اہل فلسفہ و کلام نے اس کی تعریف متعین کرنے کی جو مختلف کاوشیں کی ہیں، ان میں ان حضرات کا رخ غلط ہو گیا ہے۔ یہ لوگ علم کو اتنا موضوعی (subjective) بنا دیتے ہیں کہ وہ معروضی پن (objectivity) غائب ہو جاتا ہے. جس سے انقطاع کی حالت میں علم کی بنیاد ہی نہیں پڑ سکتی۔ علم محض جاننے کا حال نہیں ہے بلکہ

معلوم کا ایسا حضور ہے جو صرف ذہنی نہیں ہے بلکہ ذہنی بھی ہے ۔
مولاناؒ علم کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ ''علم وہ شے ہے جس کے ذریعہ وجود کو عدم سے تمیز ہو جائے کہ یہ شے ہے اور نہیں ہے ۔ ۔ ۔ تمام محسوسات ہوں ۔ معقولات ہوں ۔ نسبت ہو ۔ کوئی شے ہو ۔ اس کے نہ ہونے کی ہونے سے تمیز جس شے سے ہو جائے ، اسی کا نام علم ہے ۔ خواہ وہ روحانی طریقے سے ہو ۔ خواہ عقلی طریقے سے ۔ خواہ وہ حسی طریقے سے ہو ۔ ۔ ۔ بہرحال جس ذریعے سے شے کے ہونے کو نہ ہونے سے تمیز ہو جائے ، اس کے ذریعہ کا نام علم ہے'' (۱۴) ۔
یہ تصورِ علم اپنے اکثر اجزا میں کلامی روایت کے اندر ایک بالکل نئی بات ہے ۔ علم کی اس تعریف میں ایک تو وہی بات حاصل ہو جاتی ہے جس کا ابھی ذکر ہوا ، کہ علم ذہنی سے زیادہ وجودی امر بن جاتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام غیر عقلی قویٰ ایک حالتِ ادراک

میں رہتے ہیں جو ان کی اپنی اپنی سرگرمیوں کا مبدا ہے ۔ ادراک کی یہ حالتیں وجدانی صورت اختیار کر جائیں تو یہ علم کی حرکت ہے ذہن سے وجود کی طرف ۔ اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ علم صرف ذہنی نہیں ہوتا بلکہ وجود کا ایسا حال بن جاتا ہے جس کی بنیاد پر 'میں ہوں' اور 'وہ ہے' کا دعویٰ دلیل اور تفکر کا ضرورت مند نہیں رہتا ۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اپنے داخلی نتائج کے اعتبار سے علم ذہنی کم اور وجودی زیادہ ہوتا ہے ۔ اور دوسرے یہ کہ شعور و وجود کے قدیم ترین اور جدید ترین مبحث میں مولاناؒ کی یہ بات بہت سے اشکالات و مسائل کو حل کر سکتی ہے ۔ مثال کے طور پر جہل کا علم بھی علم ہے ، یعنی اس سے 'ہونے' اور 'نہ ہونے' کے قطبین کا توازن ادراک میں بھی آجاتا ہے اور 'نہ ہونا' ، وجود کے تناظر میں جس معنویت کا یقینی حامل ہے ، اس تک بھی رسائی کا دروازہ کھل جاتا ہے ۔ مولاناؒ کا یہ

تصور اگر ہائیڈیگرا یسے لوگوں کے سامنے بھی رکھا جائے تو ان کی طرف سے کسی بنیادی اختلاف کی توقع نہیں ہے، کہ وجود کے شعور کی تعمیر میں عدم کی معنویت شریکِ حال رہتی ہے، اور پھر کمال کی بات یہ ہے کہ مولاناؒ 'ہونا' تو ایک طرف 'نہ ہونے' کو بھی اسی شے سے منسوب کرتے ہیں جس کا وجود اساسِ علم ہے۔ یہ

paradoxical pattern of

knowledge شعور اور وجود کی متوازیت اور انہیں ہم اصل رکھنے والی حقیقی نسبت کا ایسا انکشاف کرتی ہے جس سے علم اور معلوم دونوں کی یک جان معرفت ممکن ہو جاتی ہے۔ علم کا منتہا اس کے سوا کیا ہے کہ ہم یہ کہنے کے قابل ہو جائیں کہ علم، ادراک اور

مدرک کے اتصال یا عینیت کا تجربہ ہے، یا شعور اور وجود کی دوئی میں رہتے ہوئے ان کی اصولی وحدت کی دریافت کا حال ہے۔

مسئلہ زمان معقولات کے بنیادی مسائل میں سے ہے۔ کلاسیکی روایتیں، مذہبی ہوں یا عقلی، زمانے کو مکان سے ممتاز سمجھ کر اس کا تجزیہ و تحقیق کیا کرتی تھیں اور زمان و مکان کی دوئی میں تضاد کی نسبت دیکھے بغیر ان کا ایک دوسرے سے بے نیاز حالت میں مطالعہ کیا کرتی تھیں۔ یونانی فلسفے میں البتہ کچھ ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مابعدِ سقراط یونانی ذہن، مادے اور وقت میں التزام کی نسبت کو محسوس تو کرتا تھا مگر ان دونوں میں عینیت کا عقلی یا حسی جوہر تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہوا تھا۔ مادے کی قدامت کا مسئلہ اس دعوے کو لائقِ تسلیم نہ سہی، قابلِ فہم ضرور بناتا ہے کہ اس مبحث میں یونانی فکر میں زمان و مکان کی ایک ایسی اکائی کا تصور

پیدا ہونے کے مراحل میں تھا جو خود زمانی مکانی نہیں ہے۔ مادے کو مکانیت اور ازلیت کو زمانیت کی اصل پر رکھ کر فلسفہ یونان کے بڑے حصے میں، جس میں سقراط سے پہلے کے فلاسفہ بھی شامل ہیں، یہ تصور مضبوط بنیادوں پر تشکیل پاتا ہوا نظر آتا ہے کہ یہ دونوں یعنی زمان و مکان کسی مشترک امر کے مظاہر نہیں۔ تاہم اس غیر مدرک انکشاف کو استدلال کا پیرایہ دینے میں یونانی کامیاب نہ ہو سکے۔ مسلم فکر میں بھی فلسفیانہ تناظر میں یہی صورتِ حال غالب رہی، لیکن علم کلام میں زمان و مکان کی دوئی پر اصرار کرتے ہوئے انہیں تعقل کے الگ الگ دائروں میں رکھا گیا۔ متکلمین کا عمومی میلان اس طرف تھا کہ زمان و مکان کو مخلوق اور حادث قرار دیا جائے اور چونکہ خلق و حدوث کے دائرے میں چیزیں کثرت اور امتیاز کی اساس پر دیکھی جاتی ہیں، اس لئے ہماری کلامی روایت میں زمان و مکان کی

امکانی اور خالص عقلی وحدت تک پہنچنے کو کوئی مربوط اور سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔

مکان کو محسوس اور زمان کو معقول مان لینے کے اکثریتی رویے کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسئلہ زمان پر تو خوب غور کیا گیا لیکن مکان کو ایک طے شدہ اثبات کا موضوع بنا کر اس پر کوئی بڑی تحقیق نہیں ہوئی۔ وقت کا وجودی امتیاز حرکت، اور مکان کا اصول سکون تھا، اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں بنیادی نسبت تضاد کی نہ سہی مگر زیادہ تر قبل و بعد کے تناظر میں تھا اور حرکت کو ماہیت زمان کہنے کا زیادہ تر منشا یہی تھا کہ زمانے کی متعین قبلیت، یعنی اس کا مخلوق ہونا ثابت ہو جائے۔ البتہ باقلّانی ایسے بعض متکلمین نے مقولہ حرکت کی بنیاد پر زمان و مکان میں ایک وحدت جزوی کا خفیف سا امکان ضرور پیدا کیا۔ لیکن ان کے ذہن میں بھی یہ بات وضاحت اور صفائی کے ساتھ نہیں نظر آتی

کہ زمان و مکان کا ایک ہونا یا واحد الحقیقت ہونا عقلی اور حسی دلیل سے ممکن ہے۔ باقلّانی وغیرہ نے مکان میں بھی حرکت کا اثبات تو کیا لیکن یہ حرکت داخلی اتنی زیادہ تھی کہ واقعے سے زیادہ تخیل کا نتیجہ لگتی تھی۔

مولاناؒ نے زمان کی عقلی تحلیل اور حِسّی تقسیم کی روایتوں کو خاصی تنقیدی نگاہ سے دیکھا، ان کے نقائص دریافت کیے اور پھر وقت کی ایسی تعریف وضع کی جو باعتبارِ کلیت (Universally) تو روایتی ہی تھی لیکن بلحاظ جزئیت (Particularly) ایک نئی چیز تھی۔ مولاناؒ نے زمان کے روایتی تناظر کو نہیں چھیڑا اور اس میں رہتے ہوئے زمان کی تعریف قریب کو بدل دیا۔ یہ خاصی حیرت انگیز بات ہے کہ جدید فلسفیانہ اور سائنسی نظریات سے بالکل لاتعلقی کی

حالت میں بھی مولاناؒ زمان و مکان کے اس جوہرِ اضافیت تک پہنچ گئے جس کی رو سے کم از کم وقت کا کوئی ایک نظام نہیں ہے۔ زمانے کا سیاق و سباق جو مکانی ہوتا ہے، بدلتا رہتا ہے، اور یہ تبدیلی زمان کی ثانوی تعریفات کو بھی ہمہ گیر نہیں رہنے دیتیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ''یہ بات نامناسب اور بے عقلی کی ہے کہ ایک عالم یا ایک میل کی چیز کو دوسرے عالم یا دوسرے میل کی چیز کے ساتھ گڈمڈ کیا جائے۔۔۔ جتنی بھی علمی، فلسفی اور مذہبی دشواریاں اور الجھنیں پیدا ہوئی ہیں، وہ صرف اسی التباس سے ہوئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ لاینحل ہو کر رہ گئی ہیں'' (۱۵)۔

مولاناؒ اپنی تنقید کا آغاز ارسطو سے کرتے ہیں جسے مسلم فلسفے کی روایت میں معلم اول کا لقب دیا گیا ہے۔ ارسطو مادے اور وقت

کے قِدم (eternity) کا قائل تھا، اور اسی کے زیرِ اثر مسلم فلاسفہ کی اکثریت کا بھی یہی نظریہ تھا۔ ارسطو کے دعوے پر جرح کرتے ہوئے مولاناؒ کہتے ہیں کہ ''ارسطو کو یہ الجھن پیدا ہوئی کہ زمانہ قدیم ہے، اس لئے کہ اگر حادث ہو گا یعنی موجود بعد العدم ہو گا یعنی پہلے نہ تھا اور پھر ہوا تو اب اس کا نہ ہونا اس کے ہونے پر مقدم ہو گا۔۔۔ یہ تقدیم و تاخیر ایسی ہے جو جمع نہیں ہو سکتی یعنی مقدم اور موخر جمع نہیں ہو سکتے۔ اور جو تقدیم و تاخیر ایسی ہو کہ جمع نہ ہو سکے تو وہ تقدیم و تاخیر زمانی ہے۔ تو گویا حادث ہونے کے معنی یہ ہوئے کہ عدم زمانہ کا زمانہ وجودِ زمانہ کے زمانہ سے مقدم ہے۔ اور وجودِ زمانہ کا زمانہ عدمِ زمانہ کے زمانہ سے موخر ہے اور فرض یہ کیا تھا کہ زمانہ نہیں تھا۔ پھر ہوا۔۔۔ تو اب زمانے کے نہ ہونے میں زمانہ ہو گیا، اور نہ

ہونے میں ہونا محال ہے، لہٰذا یہ محال زمانے کا عدم فرض کرنے سے لازم آیا ہے، لہٰذا جس چیز سے محال لازم آئے، وہ بھی محال ہے۔ لہذا عدم زمان محال ہے" (١٦)۔ ارسطو کا ایک مشہور فقرہ ہے کہ جو شخص زمانے کے حدوث کا قائل ہے، وہ فی الحقیقت زمانے کی قدامت کو مانتا ہے لیکن اسے اس کا شعور نہیں۔ ارسطو کے نزدیک حدوث کو قِدم لازم ہے۔

اس کے جواب میں مولاناؒ فرماتے ہیں کہ "یہاں غلطی یہ ہوئی ہے کہ حوادثِ زمانیہ میں یعنی زمانیات کے عالم میں زمانے کو داخل کر دیا ہے حالانکہ زمانہ کا عالم علیحدہ ہے اور زمانیات کا علیحدہ ہے۔ حوادثِ زمانہ اور زمانیات کے لیے زمانہ ہے، یعنی زمانیات کا ظرف زمانہ، اور زمانہ کے لیے کوئی ظرف نہیں ہے، کوئی زمانہ نہیں ہے" (١٧)۔ اس بات کو ذرا وٹگنسٹائن کے اس قول سے ملا کر دیکھیے کہ دنیا چیزوں

کا نہیں، واقعات کا مجموعہ ہے۔ وٹگنسٹائن نے یہ بات اس ماحول میں کہی ہے جہاں زمان و مکان میں عطف حقیقی نہیں مگر اضافی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی قابل غور ہے کہ زمان ظرف ہے، مظروف نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت خود موجود نہیں ہے بلکہ وجود کی وہ شرط ہے جو تمام موجودات کو محیط ہوتی ہے۔ ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ جو غیر قدیم امر کسی اور امر کا مظروف نہ ہو، وہ اعتباری ہوتا ہے، واقعی نہیں۔ یعنی موجودات بمعنی حوادث کا ظرف ہے مگر خود موجود نہیں ہے۔ اور اس کے موجود نہ ہونے کا حال چونکہ نظام الوجود پر موثر ہے، لہذا اسے معدوم بھی نہیں کہا جا سکتا، اس ضروری اور اصولی خیال کی طرح جس پر ہونے نہ ہونے کے مقولات (categories) وارد نہیں ہوتے۔

ہمارے فلاسفہ و متکلمین دونوں حدوث کی دو قسمیں کرتے ہیں : حدوث زمانی اور حدوث ذاتی۔ یہی دو قسمیں وجود حادث کی بھی ہیں : حادث بالزماں اور حادث بالذات۔ فلاسفہ کے ایک بڑے گروہ کی رائے یہ ہے کہ زمانہ حادث بالذات ہے، حادث بالزماں نہیں۔ بادی النظر میں یہ لفظی ہیر پھیر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ''قدماء فلاسفہ کے نزدیک حادث بالذات ہی قدیم بالزمان ہے اور ان کے نزدیک عالم کے قدیم ہونے کے اور زمانے کے قدیم ہونے کے یہی معنی ہیں تو اس کا حل یہ ہے کہ ہمارے نزدیک حادث کے معنی موجود بعد العدم کے نہیں ہیں جیسا کہ قوم (یعنی متکلمین) کہہ رہی ہے، اور نہ مسبوق بالعلۃ کے ہیں جیسا کہ فلسفی کا خیال ہے، یعنی مرتبہ ذات میں معلول ہے۔ یہ معنی حدوث ذاتی کے ہیں۔۔۔ اور علت قدیم ہے تو معلول بھی قدیم ہوگیا۔ یعنی عالم قدیم

بالزمان اور حادث بالذات ہے۔۔۔ یعنی زمانے کے لئے ابتدا تو مان لی گئی لیکن اس کا مسبوق بالعدم نہ ہونا اور پھر اس کے وجود کی ابتدا ہونا یہ بعید از تصور ہے'' (۱۸)۔ یہاں بعید از تصور سے مولاناؒ کی مراد ہے کہ مہمل ہے۔

مولاناؒ مزید فرماتے ہیں، ''عالم کے حادث ہونے سے پہلے نہ وقت ہے نہ پہل ہے۔ یعنی کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کو 'پہلے' کہا جا سکے۔ بلکہ پہلی پہل یہ عالم ہی ہے، کسی اور پہل کا سوال ہی نہیں ہو سکتا۔۔۔ جس وقت عالم کو پیدا کیا، وہ اول وقت تھا، اس سے پہلے نہ وقت تھا نہ اور کوئی چیز تھی۔۔۔ حوادث کا سلسلہ قدم تک نہیں جا رہا۔ یہ اول معدود پر رک جاتا ہے، اس سے آگے لائن خالی یا بھری ہوئی نہیں ہے۔ خالی لائن متکلمین کے نزدیک ہے اور بھری ہوئی لائن حکماء کے نزدیک ہے۔ یہ دونوں خیال غلط ہیں۔ یہ لائن اول

معدود پر کٹ جاتی ہے۔ اس لائن پر ہر گز ہر گز قدم نہیں ملے گا۔۔۔
کیونکہ قدم اس لائن کے شروع اور اول میں واقع ہی نہیں ہے''
(۱۹)۔

یہ ہے زمانے کی وہ حقیقت جس کے بارے میں اعتماد سے کہا جا سکتا ہے کہ ہماری روایت میں اس کا انکشاف مولاناؒ پر ہوا۔ زمانے کو حدوث کے دائرے سے نکالنا گویا اس کے زمانہ ہونے سے انکار کرنا ہے۔ جبکہ قِدم کا دائرہ ایک تنزیہ مطلق رکھتا ہے جس میں زمانہ اور زمانی پن وہم کے راستے سے بھی داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ ساری بحث ہی لغو ہے کہ زمانے کا حدوث ذاتی ہے یا نہیں؟ یہ خلطِ حقائق ہے، جو ہر محال سے بڑھ کر محال ہے۔ وجود و عدم یکجا ہو سکتے ہیں لیکن حدوث و قدم نہیں۔

روایتی یا روایتی مزاج کے متکلمین میں مولاناؒ کی انفرادیت اور اہمیت یہ ہے کہ آج کی دنیا اور ذہن کے لیے بھی ان کے استدلال میں ایک ایسی تاثیر اور کشش ہے جو ان کے اکثر نظریات کو پرانا ہونے سے بچائے ہوئے ہے۔ مولاناؒ نے علم اور وجود کے مستقل مباحث پر جو تفصیلی موقف اختیار کیا ہے، وہ جدید ترین نظریہ علم اور تصورِ دنیا سے متصادم حالت میں بھی اجنبیت نہیں رکھتا۔ مولاناؒ نے علم کے مبادی میں جس طرح ارادہ واختیار کو شامل دکھایا ہے، وہ طریقِ استدلال آج کے متعلقہ اور معروف ترین نظریات میں جگہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مولاناؒ کی مجموعی فکر معنی میں روایتی ہونے کے باوجود حیرت انگیز طور پر استدلال کی تازگی رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر حقائق (Realities) پر جس طرح وہ شعور کی موجودہ ساخت

سے استدلال کرتے ہیں، وہ کلام کی روایت میں ناپید ہے اور جدید ترین تناظرِ علم کے ساتھ اصطلاحات میں مشترک ہے۔ کسی علمی discourse کے لیے یہ ایک نادر وصف ہے کہ وہ اپنے زمانے کے discourse سے معنی میں مختلف ہونے کے باوجود اپنے طریقِ اظہار کی بدولت ایک تاثیر کا حامل ہو۔ مولاناؒ کے معانی قدیم ہیں، لیکن ان کا استدلال اوراظہاری درو بست ایسا ہے کہ معنی کی قدامت، بات کو فرسودہ نہیں بننے دیتی بلکہ نت نئی تازگی کی موجب بن جاتی ہے۔

موجودہ دور اپنے غالب رجحان کے ساتھ خدا کے انکار یا اس سے لاتعلقی کا دور ہے۔ یہ اتنا قوی رجحان ہے کہ اس کے اثرات اور نتائج مسلم دنیا میں بھی مرتب ہو رہے ہیں بلکہ مذہبی بیانیوں

(narratives) میں بھی در آئے ہیں۔ خدا کا انکار تو ایک قدیم رویہ ہے اور اس کا مایہ استدلال بھی تقریباً ایک چلا آ رہا ہے، لیکن آج کی دنیا میں خدا سے لاتعلقی کا جو مزاج راسخ ہو چکا ہے، وہ انکار سے زیادہ شدید اور نتیجہ خیز ہے۔ مذہبی ذہن نے خدا کے انکار کے ممکنہ دلائل کا بھی توڑ بہت پہلے کر لیا تھا، لیکن اس سے لاتعلقی کے مظاہر بالکل نئی چیز ہیں جن کا مذہبی ذہن کو پہلے کبھی سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس لاتعلقی سے مکمل ناواقفیت کی وجہ سے مسلم ذہن میں خدا کو ماننے کا انداز مطلقیت سے عاری اور اضافیت کے تابع ہوتا جا رہا ہے۔ خدا بھی میرا تیرا ہو گیا ہے، سب کا نہیں رہا۔ خود ان لوگوں کی بھی اچھی خاصی تعداد اس مزاجِ لاتعلقی سے پوری طرح محفوظ نہ رہ سکی جنہیں علمائے دین سمجھا جاتا ہے۔ ان کے یہاں بھی خدا کو ماننا خدا سے

تعلق پر شاہد نہیں رہ گیا۔ مذہبی ذہن اور تہذیب کو پیش آنے والے تمام خطرات میں یہ سب سے بڑا خطرہ ہے۔ مولاناؒ کا کلام دیکھ کر بعض مقامات پر حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود و صفات وغیرہ پر ان کے دلائل محض مفیدِ اثبات نہیں ہیں بلکہ موجبِ تعلق بھی ہیں۔ وہ خدا کو اس کی مسلمہ شان کے ساتھ اس زور سے ثابت کرتے ہیں کہ ذہن کو تعلق باللہ کے احوال کا تجربہ ہونے لگتا ہے۔ اگر ذرا باریکی سے تجزیہ کیا جائے تو مولاناؒ کے الٰہیاتی استدلال کی عمومی ساخت میں کارفرما یہ مستقل عنصرِ تعلق پوری وضاحت کے ساتھ نظر آسکتا ہے۔ صرف اس بنیاد پر مولاناؒ کو مجدّدِ کلام کہا جاسکتا ہے۔

غرض ذہنِ جدید کا ایک بڑا خلا جسے وہ خود محسوس کر رہا ہے، یہ ہے کہ عقل مابعد الطبیعی اور مافوق تجربی امور سے اپنی مناسبت کو ترک کر چکی ہے۔ یہ احساس جدید شعور میں پوری طرح سرایت کیے ہوئے ہے

کہ عقل میں ما بعد الطبیعی عنصر کے غائب ہو جانے کی وجہ سے تجرید کا ایک بے ہدف، بے اصل اور نا مختتم عمل شروع ہو چکا ہے، جس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ یہ بڑا المیہ ہے کہ عقل اپنی بہترین صلاحیتوں کو حصول کی بجائے فقدان کے ماحول میں صرف کرے۔ آخر کوئی تو سبب ہے کہ ذہنِ جدید اپنے اندر بھڑکتی ہوئی پیاس کو بجھانے کے لیے حسی objects کو over-subjectivize کرنے کا عادی بنتا جا رہا ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ عقل کو اس طرح define کرتے ہیں اور علم کے حدود میں اس گمشدہ وسعت کو پھر سے واپس لاتے ہیں کہ ذہنِ جدید کا خود ساختہ جبر اور موہوم اختیار اپنی جگہ چھوڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حاصلِ کلام یہ

کہ اس طرح کئی پہلو ہیں جو ہمارے زمانے میں مولانا رحمۃ اللہ کی
effective relevance کو ثابت کرتے ہیں۔

**

ایک اوکھا، انوکھا دکاندار

مشتاق احمد یوسفی

7اکتوبر,2021

https://jaeza.pk/taasrat/maulanamuhammadayubdehlvi-mushtaqahmadyusufi/

نوٹ : زیرِ نظر سطور مشتاق احمد یوسفی صاحب کی کتاب شام شعر یاراں سے مستعار ہیں۔

''فقر و استغناء کا تذکرہ'' مولانا ایوب دہلوی کے ذکر کے بغیر بالکل ادھورا رہے گا۔ میں نے مولانا کو اپنے عزیز دوست میاں فضل حسن کے ہاں دیکھا اور گھنٹوں بڑے شوق اور ادب سے سنا۔ وہ ان کے ہاں اتوار کے اتوار تشریف لاتے تھے۔ فضل صاحب ان کے فرمودات بڑے عقیدت اور باقاعدگی سے ریکارڈ کرتے۔ حکیم سعید صاحب کے پاس بھی ان کی باتیں بیسویں کیسٹوں پر محفوظ تھیں، جن کے کچھ حصے چھپ چکے ہیں۔ دور ہو یا قریب، کہیں بھی جانا ہو، میں نے مولانا کو ہمیشہ پیدل ہی آتے جاتے اور دسمبر اور جنوری میں بھی صرف ململ ہی کے کرتے میں دیکھا۔ دقیق سے دقیق نقطے کو باتوں ہی باتوں میں بہت سہل اور سجل پیرائے میں بیان کر دیتے۔ جتنی

رسان سے وہ سمجھاتے اتنی ہی آسانی سے بات سمجھ میں آ جاتی۔ جس موضوع پر گفتگو کرتے اس کے اختتام پر فوراً اٹھ کھڑے ہوتے۔ چائے، مشروبات، کھانے اور کسی بھی قسم کے تواضع سے پہلے ہی بعجلت رخصت ہو جاتے۔

بندر روڈ کے آخری سرے پر میری ویدرٹاور کے نزدیک مولانا کی ''لیدر گڈس'' (چمڑے کے سامان) بالخصوص سوٹ کیسوں کی دکان تھی۔ وہ صبح گیارہ بجے خود دکان کھولتے اور فروختنی اشیاء کو ڈسٹر سے جھاڑ پھونک کر ترتیب سے سجاتے۔ جیسے ہی اتنی بکری (فروخت) ہو جاتی کہ دن کا خرچ نکل آئے، وہ فوراً تالا لگا کے اپنی (beat) معمول کا گشت پر نکل جاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ پوری طرح دکان کھلنے سے پیشتر ہی بوہنی دن کی دال روٹی جوگے ہو جاتی تو

وہ ڈسٹر پھینک پھانک کر دکان کا شٹر گرا دیتے! اکثر و بیشتر دو تین گھنٹے ضرور لگ جاتے۔ آج اور صرف آج کی حاجت و ضروریات سے زیادہ بکری و منافع کے وہ طالب تھے نہ قائل۔ فقر و قناعت کی اس کٹھن روش پر درجۂ کمال تک قائم رہنا اسی حالت میں ممکن ہے کہ وہ بندے کو خیر الرازقین کی حکمت رزاقی پر کامل یقین ہو۔ ان کی عظمت و برگزیدگی کے تو سب ہی قائل تھے لیکن ان کے اہل خانہ اور لواحقین کے توکل اور نہفتہ عظمت پر شاذ و بادر ہی کسی کی نظر گئی ہو! سلام ہو ان پر۔

مولانا کو جب اور جہاں بھی دیکھا، ایسا ہی لگا کہ بہت جلدی میں ہیں۔ جس عاجلانہ و فقیرانہ شان سے آئے ہیں، اسی طور کہیں اور جانے کی جلدی ہے۔ مولانا نے ساری زندگی اسی وضع و نہج پر گزاری اور پایان

عمر بھری بزم کو حسن سماعت میں گم چھوڑ کر جہاں جانا تھا، اسی طور شتابی چلے گئے۔

***

حافظ محمد ایوب دہلوی

ملا واحدی

7اکتوبر، 2021

https://jaeza.pk/yad-nigari/maulanamuhammadayub dehlvi-mullawahidi/

نوٹ : زیر نظر سطور ملا واحدی کی کتاب ''میرے زمانے کی دہلی'' سے مستعار ہیں۔

مولانا محمد ایوب مولانا محمد اسحاق رام پوری کے شاگرد ہیں۔ مولانا محمد اسحاق نے ساٹھ برس لوگوں کو پڑھایا۔ مدرسہ نذیریہ کے طلباء نے ممکن ہے اُن سے کچھ سیکھا ہو۔ لیکن مولانا اسحاق کے تمام گھریلو شاگرد میری طرح کورے ہی رہے۔ میں بھی مولانا محمد اسحاق کا شاگرد ہوں اور "مولانا محمد ایوب" سے پہلے کا شاگرد ہوں۔

مولانا محمد ایوب تنہا شخص ہیں جنھوں نے مولانا محمد اسحاق سے پورا فیض پایا اور ایک چیز تو ایسی حاصل کر لی کہ اُس میں مولانا محمد اسحاق پر فوقیت لے گئے۔ مولانا محمد اسحاق قرآن، حدیث، فقہ سب علوم میں یکتائے روزگار تھے۔ لیکن منطق اور فلسفہ و حکمت اُن کا خاص مضمون تھا۔ منطق اور فلسفہ و حکمت کا اُنھیں اسپیشلسٹ

(specialist) کہنا چاہیے۔ مولانا محمد ایوب نے بھی منطق اور فلسفہ و حکمت میں کمال پیدا کیا ہے۔

منطقیوں کا دماغ عموماً مذہب کے خلاف جایا کرتا ہے۔ لیکن مولانا محمد اسحٰق منطق سے اسلام کی تائید کا کام لیتے تھے۔ مولانا محمد ایوب کی بھی یہی روش ہے اور اس روش پر چلنے کے مولانا محمد ایوب کو مولانا اسحٰق سے زیادہ مواقع ملے ہیں۔

مولانا محمد ایوب تیئس (23) سال کے تھے جب پہلی دفعہ حکیم علی رضا خاں کی تلاش کرتے میرے ہاں پہنچے۔ حکیم صاحب کسی مریض کو دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ اُس دن سے 1947ء تک دِلّی میں چھبیس ستائیس برس مسلسل مولانا محمد ایوب مجھ پر کرم فرماتے رہے۔

مولانا محمد ایوب جب بولتے ہیں تو گھنٹوں بولتے ہیں۔ اب ساٹھ سال سے اوپر عمر ہے۔ قریباً چالیس سال سے بول رہے ہیں اور چالیس سال میں بلا مبالغہ چھ سات ہزار تقریریں کر چکے ہیں۔ مشق کا کوئی ٹھکانہ ہے۔

علمی اور دقیق مضامین ایسی عام فہم زبان میں بیان کرتے ہیں کہ بے پڑھے لکھے مسلمان اور اسلام سے ناواقف غیر مسلم سمجھ لیتے ہیں۔

دِلّی میں ایک ہندو صوفی ہیں۔ پنڈت تیلو رام۔ اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں اُن کا ذکر کر چکا ہوں۔ پنڈت جی بھی مولانا محمد ایوب کی تقریریں سننے آتے تھے۔ یکایک آنا بند کر دیا۔ میں نے سبب پوچھا۔ ایمان سر کنے لگا تھا اور اس کے لیے دل تیار نہیں تھا۔

مولانا کی تقریریں سننے سے اسلام کے متعلق کوئی شک شبہ باقی نہیں رہ سکتا۔ بولنے کی طرح لکھنے کا چسکہ نہیں ہے (نوٹ از مصنف : اب

لکھنا بھی شروع کر دیا ہے)۔ ورنہ اللہ تعالیٰ نے امام غزالی رحمہ اللہ کا سا دماغ عطا کیا تھا۔ کسی کو اپنی عقل پر گھمنڈ ہو تو وہ مولانا محمد ایوب کی تقریریں سُن لے، اُسے اپنی عقل کی بے بضاعتی کا پتہ لگ جائے گا۔ مولانا محمد ایوب کی عقل کی دست رس ہر مدّعی عقل کی دست رس سے آگے ہے۔ مولانا عقل و عرفان کے سمندر میں اُس تہہ تک پہنچ جاتے ہیں جہاں بڑے بڑے مدعیان عقل نہیں پہنچ سکتے۔

مجھے مولانا محمد ایوب کی تقریروں سے بے حد فائدہ پہنچا ہے۔ میں اُن کے اِس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ خواجہ حسن نظامی کے ذریعہ اللہ نے مذہب کی طرف متوجہ فرمایا تھا، مولانا محمد ایوب کی تقریریں سنوا کر ایمان مستحکم کر دیا۔ مولانا محمد ایوب مجھ سے دس برس چھوٹے ہیں، لیکن میں انھیں اپنا بزرگ سمجھتا ہوں۔ میری تحریر میں تھوڑی بہت کوئی بات ہے تو وہ خواجہ حسن نظامی کی پچاس سالہ ہم نشینی کا

نتیجہ ہے اور کسی قدر غور و فکر کرنا مجھے آیا ہے تو مولانا محمد ایوب کی چالیس سالہ صحبت سے آیا ہے۔

مولانا محمد ایوب نے مولویت کو پیشہ نہیں بنایا ہے۔ دِلّی میں پرانی ساڑھیوں کی تجارت کرتے تھے۔ کراچی میں بھی کپڑے کی دوکان ہے۔

(1) دِلّی میں میرے علاوہ حکیم علی رضا خاں اور نواب فیض احمد خاں کے دیوان خانے میں تقریریں کیا کرتے تھے۔

(2) کراچی میں ایک اتوار بیچ جناب اسد ملتانی کے ہاں تقریریں ہوتی ہیں۔ الحمدللہ میں چالیس سال سے مسلسل یہ تقریریں سن رہا ہوں۔

(از مصنف) نواب فیض احمد خاں کا دیوان خانہ حکیم اجمل خاں کے دیوان خانے کے بعد میرے زمانے کی دلّی کا سب سے اہم دیوان خانہ تھا۔ اس میں مولانا محمد ایوب کی تقریریں ہی نہیں ہوتی تھیں،

مسلمانوں کی تقدیر کے فیصلے بھی ہوتے تھے۔ نواب صاحب کے دیوان خانے کے علاوہ میں نے حکیم اجمل خاں، حکیم رضی الدین خاں، ہزہائی نس نواب سر امیر الدین احمد خاں والی لوہارو، نواب احمد سعید خاں طالب، ڈپٹی اکرام اللہ خاں، ڈپٹی ہادی حسین خاں اور نواب سلطان مرزا کے دیوان خانے دیکھے ہیں۔ حکیم واصل خاں کا دیوان خانہ بھی دیکھا ہے۔ حکیم عبد المجید کا دیوان خانہ بھی خواب سا یاد ہے۔ اور حکیم محمد احمد خاں اور حکیم غلام کبریا خاں عرف بھورے میاں کے دیوان خانے تو کل کی بات ہے۔ ہاں ایک دیوان خانہ اور تھا۔ محلہ مٹیا محل میں منشی کرم اللہ خاں عرف ننھے خاں کا دیوان خانہ۔ مولانا الطاف حسین حالی اِس دیوان خانے میں پابندی سے آتے تھے۔

تقریریں مولانا محمد ایوب میرے ہاں نواب فیض احمد خاں کے ہاں سے زیادہ کیا کرتے تھے۔ ایک عرصے تک انھوں نے میرے ہاں مسلسل روزانہ تقریریں کی ہیں۔ لیکن میں اپنے ہاں کے اجتماع کو یا خواجہ محمد شفیع کے ہاں کی اردو مجلس والے اجتماع کو دیوان خانے کی نشست نہیں کہہ سکتا۔ میرے ہاں کا اجتماع اور اُردو مجلس کا اجتماع اپنے اپنے رنگ کے بے مثل اجتماع تھے۔ مگر دیوان خانے کی نشست نہیں تھے۔ 2۔ جناب اسد ملتانی بحیثیت شاعر اور ماہر اقبالیات کسی تعارف کے محتاج نہیں ہے۔ قدرے غیر معروف حوالہ یہ ہے کہ وہ معروف جاسوسی ناول نگار مظہر کلیم ایم اے کے خالو اور سُسر تھے۔ راقم الحروف کے سوال پہ مظہر کلیم صاحب نے کہا کہ انھوں نے اپنی ساس اور بیگم دونوں سے مولانا محمد ایوب

دہلوی رحمہ اللہ کے بارے میں سن رکھا ہے۔ افسوس کہ زیادہ تفصیل حاصل نہیں ہو پائی۔

***

ازمرتب

کراچی کا نوحہ

شاہنواز فاروق

January 16, 2022

https://www.jasarat.com/sunday/2022/01/16/285282/

کراچی میں نظریاتی، تخلیقی اور ذہنی اعتبار سے 100 ڈائنا ساروں سے زیادہ توانائی تھی۔ لیکن کراچی کی نظریاتی، تخلیقی اور ذہنی توانائی کو تشدد اور قتل و غارت گری کی اندھی قوت میں تبدیل کردیا گیا۔ کراچی

ہر اعتبار سے ایک نو آباد شہر تھا، لیکن اس کے باوجود اس نے بڑی بڑی سیاسی تحریکیں برپا کیں۔ اس نے جنرل ایوب کی آمریت کو چیلنج کیا، بھٹو کی آمریت کے خلاف شاندار مزاحمت کی، جنرل ضیاء الحق کی پائیدار آمریت کو خوف میں بتلا کیا۔ کراچی کبھی مولانا ایوب دہلوی کا شہر تھا۔ مولانا ایوب دہلوی عصرِ حاضر کے رازی تھے۔ وہ فلسفے اور علم کلام کے موضوعات پر فی البدیہہ تقریر کرتے تو ان کی تقریر تین تین چار چار گھنٹے جاری رہتی اور مولانا فکر کی پوری تاریخ پر چھائے نظر آتے۔ مولانا قرآن مجید کی تفسیر بیان کرتے تو ایسا لگتا کہ انہیں تفسیر کی پوری روایت ازبر ہے۔

کراچی محمد حسن عسکری کا شہر تھا جو اردو کے سب سے بڑے نقاد تھے۔ ان کی سطح کا علم نایاب تھا۔ انہوں نے مغربی ادب پر بعض ایسے مضامین لکھے ہیں کہ خود مغرب کی تنقید میں ان کی مثال نہیں

ملتی۔ ان کا تخلیقی جوہر اقبال کی سطح کا تھا۔ عسکری صاحب جب تک زندہ رہے اردو ادب کا مرکزی حوالہ تھے، لیکن انتقال کے بعد اُن کی اہمیت کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی۔

کراچی کبھی سلیم احمد کا شہر تھا۔ عسکری اور سلیم احمد کی تنقید کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو اس کی اہمیت یہ ہے کہ عسکری اور سلیم احمد کی تنقید پڑھے بغیر آپ اردو ادب کے بارے میں کم از کم 90 فیصد بنیادی باتیں نہیں جان سکتے۔ لیکن سلیم احمد صرف نقاد نہیں تھے، وہ شاعر بھی تھے اور جدید اردو ادب میں ان کی شاعری جیسا تنوع نایاب ہے۔ سلیم احمد کی ایک اہمیت یہ تھی کہ وہ کراچی میں ادیبوں اور شاعروں کا محور تھے۔ کراچی میں جتنی ادبی اور علمی بحثیں چلتی تھیں سلیم احمد سے چلتی تھیں۔ انہوں نے ریڈیو کے لیے پونے دو سو

ڈرامے لکھے، مگر ان کی بے نیازی کا عالم یہ تھا کہ وہ ان ڈراموں کا ذکر بھی نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ انہیں ’’کمرشل سرگرمی‘‘ سمجھتے تھے۔

کراچی عزیز حامد مدنی کا شہر تھا جن کی غزل اور جن کی نظم فیض احمد فیض کی غزل اور نظم سے کم از کم سوگنا بڑی ہے۔ اس کے باوجود وہ گوشہ نشین آدمی تھے۔ وہ شہرت سے اس طرح بھاگتے جیسے شہرت کوئی سزا ہو۔ ان کے باطن کی نفاست ان کے چہرے سے ظاہر ہوتی تھی۔ ان کی انسانیت اتنی بڑی تھی کہ انہوں نے اپنے بھائی کے بچوں کو پالنے کے لیے تمام عمر شادی نہیں کی۔

کراچی قمر جمیل کا شہر تھا۔ ان کے لیے ادب ایک طرزِ حیات تھا۔ قمر جمیل جدیدیت کے علَم بردار تھے۔ ان کا ہر لمحہ مغربی دانشوروں کے ساتھ بسر ہوتا۔ وہ مغرب کے مفکرین اور دانشوروں کو اس طرح کوٹ کرتے تھے جیسے وہ انہیں بچپن سے جانتے ہیں۔ وہ جدید اردو

ادب میں نثری نظم کے امام تھے اور پوری اردو دنیا انہیں اسی حیثیت میں جانتی تھی۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو کراچی نظریات کا شہر تھا۔ تخلیقی روایات کا شہر تھا۔ علمی رجحانات کا شہر تھا۔ امکانات کا شہر تھا۔ لیکن ان تمام چیزوں کی توانائی کو تخریب کی توانائی میں بدل دیا گیا اور اس کے آغاز کا سہرا جنرل ضیاء الحق کے سر ہے، جنھوں نے ایم کیو ایم تخلیق کی۔ کراچی کے بارے میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ کراچی کی تخریب بیشتر صورتوں میں ''کنٹرولڈ تخریب'' ہے۔ کراچی کی قتل و غارت گری منضبط منصوبہ بند قتل و غارت گری ہے۔ جب بھی کراچی میں قتل و غارت گری ہوتی اس عرصے میں نہ کہیں صوبائی حکومت نظر آتی، نہ وفاقی حکومت۔ نہ کہیں پولیس کا نام و نشان ہوتا، نہ کہیں رینجرز نظر آتے۔ لیکن پھر اچانک متاثرہ علاقوں میں رینجرز نمودار

ہوتے اور صرف ایک دن میں شہر کے حالات 90 فیصد معمول پر آ جاتے۔ اس طرح کے واقعات کئی مرتبہ ہوئے۔ کراچی میں جنرل ضیاء الحق کے زمانے سے آج تک یہی ہو رہا ہے۔ کراچی میں دہشت گردی کی سب سے بڑی واردات جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں قصبہ کالونی میں ہوئی۔ اس واردات میں دہشت گرد 6 گھنٹے تک گھروں میں گھس کر لوگوں کو مارتے رہے اور انہوں نے دو ڈھائی سو لوگوں کو مار ڈالا۔ لیکن سندھ کے وزیر اعلیٰ سید غوث علی شاہ نے 6 گھنٹے تک قانون نافذ کرنے والے اداروں کو قصبہ کالونی میں داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ جب چھ گھنٹے کے بعد قانون نافذ کرنے والے ادارے قصبہ کالونی میں داخل ہوئے تو وہاں نامعلوم دہشت گردوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ لیکن اس بنیاد پر شہر میں مہاجر پٹھان فساد شروع ہو گیا جس کا کوئی منطقی جواز ہی نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ

کراچی میں پٹھان ڈرائیور تھے، کنڈیکٹر تھے، مزدور تھے، موچی تھے۔ ان کے مقابلے پر مہاجر بلو کالر اور وہائٹ کالر جاب کرنے والے لوگ تھے۔ وہ نجی اداروں میں بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے۔ مطلب یہ ہے کہ شہر میں مہاجروں اور پٹھانوں کے مفادات کا کوئی تصادم ہی نہیں تھا۔

کراچی کی ایک بنیادی حقیقت یہ ہے کہ اس شہر کو پاکستان کے کسی حکمران نے اپنا نہیں سمجھا۔ اسے کبھی OWN نہیں کیا۔ پاکستان قائم ہوا تھا تو کراچی ملک کا دارالحکومت تھا۔ لیکن کراچی کے مزاحمتی کردار نے جنرل ایوب کو اتنا زچ کیا کہ انہوں نے کراچی کو اس کی مرکزیت ہی سے محروم کر دیا۔ حالانکہ کراچی میں ملک کی واحد بندرگاہ تھی۔ کراچی میں ملک کا سب سے معروف بین الاقوامی ہوائی اڈہ تھا۔

کراچی محصولات کا بڑا حصہ مرکز کو کما کر دیتا تھا۔ کراچی آبادی کے اعتبار سے سب سے بڑا شہر تھا۔ کراچی ملک کی آبادی کی نمائندگی کے اعتبار سے سب سے زیادہ نمائندہ شہر تھا۔ بھٹو صاحب قائدِ عوام تھے، قائدِ ایشیا تھے، مگر وہ کبھی بھی قائدِ کراچی نہ بن سکے۔ پاکستان کی تاریخ میں اہلیت اور میرٹ کا سب سے بڑا قتلِ عام انہی کے دور میں ہوا۔

انہوں نے کوٹہ سسٹم ایجاد کیا اور اسے ایک تلوار کی طرح کراچی کے سینے میں گھونپ دیا۔ انہوں نے صوبے میں اردو سندھی تنازع برپا کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھٹو کے خلاف سب سے شدید مزاحمت کراچی میں ہوئی۔ جنرل ضیاء الحق کی آمریت کو کسی جانب سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ لیکن جماعت اسلامی کراچی میں ان کے سب سے زیادہ ناقد موجود تھے۔ چناں چہ انہوں نے جماعت اسلامی کراچی کی سیاسی قوت کو توڑنے کے لیے ایم کیو ایم تخلیق کی۔ جماعت اسلامی کے

درویش صفت میئر عبدالستار افغانی کی بلدیہ کو زیر و زبر کیا۔ انہوں نے شہر میں لسانی منافرت کا جو بیج بویا تھا وہ ایک ایک کر کے تمام برگ و بار لایا۔ لسانی فسادات کی ابتدا مہاجر پٹھان فساد سے ہوئی تھی لیکن پھر شہر میں سندھی مہاجر فساد ہوا۔ پھر مہاجر پنجابی فساد نے شہر کو اپنی لپیٹ میں لیا، یہاں تک کہ نوبت مہاجر فساد تک پہنچی۔ ایم کیو ایم برپا ہوئی تو الطاف حسین کہا کرتے تھے کہ ہم کارنر میٹنگ کرتے ہیں اور وہ جلسہ بن جاتا ہے، اور ہمارے سیاسی حریف جلسہ کرتے ہیں تو وہ کارنر میٹنگ میں ڈھل جاتا ہے۔ الطاف حسین غلط نہیں کہتے تھے۔ یہ ایک امر واقعہ تھا، اور اس امر واقعہ سے یہ منظر طلوع ہوا کہ ایم کیو ایم کو بلدیہ، صوبے اور وفاق کی سطح پر کراچی کی 100 فیصد نمائندگی حاصل ہوئی۔ اس نمائندگی کا تقاضا یہ تھا کہ ایم کیو ایم پورے کراچی کو

OWN کرتی۔ مگر ایم کیوایم کراچی کی تمام برادریوں کو کیا خود تمام مہاجروں کو بھی OWN نہ کر سکی۔ چنانچہ وہ جماعت اسلامی کے مہاجروں سے لڑی۔ پیپلز پارٹی کے مہاجروں سے متصادم ہوئی۔ اس نے جمعیت علمائے پاکستان کے مہاجروں سے پنجہ آزمائی کی۔ بالآخر اپنی پارٹی کے مہاجروں کے ساتھ جنگ کی حالت میں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ایم کیوایم نے یہ تمام جنگیں بیشتر صورتوں میں اُس وقت لڑیں جب اسے اپنے حریفوں سے کسی سیاسی مزاحمت کا سامنا نہیں تھا۔

کراچی کا المیہ یہ ہے کہ کراچی ملک کو اس کی آمدنی کا 70 فیصد اور صوبے کو اس کی آمدنی کا 85 فیصد فراہم کرتا ہے لیکن نہ مرکز کراچی کو کچھ دیتا ہے نہ صوبہ کراچی کو کچھ دینے کے لیے تیار ہے۔ کراچی میں

کون سا مسئلہ ہے جو موجود نہیں۔ کراچی قلت آب کا شکار ہے۔ کراچی میں ٹرانسپورٹ کی سہولت کا فقدان ہے۔ کراچی میں نکاسی آب کی صورت حال ابتر ہے۔ کراچی بارشوں میں ڈوب جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ کراچی میں کچرا تک اٹھانے کا بندوبست نہیں۔ ان مسائل کے حل کے لیے نہ فوجی آمروں نے کچھ کیا نہ ہی پیپلزپارٹی اور ایم کیو ایم نے کچھ کہا۔ نہ تحریک انصاف کچھ کرتی نظر آرہی ہے۔ بلکہ پیپلزپارٹی کی حکومت نے تو کالے بلدیاتی قانون کے ذریعے کراچی کے بلدیاتی اداروں کے تمام اختیارات سلب کرلیے ہیں۔ یہ کراچی دشمنی کی انتہا ہے۔ اس صورت حال میں جماعت اسلامی میدان عمل میں نکلی ہے۔ اس نے کالے بلدیاتی قانون کو عدالت میں چیلنج کردیا ہے۔ جماعت اسلامی نے پیپلزپارٹی کی کراچی دشمنی حکومت کے خلاف مظاہرے کیے ہیں اور جماعت اسلامی سندھ کے بلدیاتی

قانون کے خلاف دھرنا دے رہی ہے۔ جماعت اسلامی کا یہ دھرنا کراچی کے لوگوں کی آواز ہے اور دھرنے سے ثابت ہو رہا ہے کہ جماعت اسلامی کراچی کے المیے کو زبان دے رہی ہے۔

**

چھوٹی سی بات

تاریخ اشاعت 20151026

عامر خاکوانی

https://dunya.com.pk/index.php
/column-detail-print/13081

معروف دانشور، شاعر اور صوفی احمد جاوید سے کئی سال پہلے میگزین کے لئے انٹرویو لیا۔ اس ایک نشست میں بہت کچھ سمجھنے، سیکھنے کو ملا۔ احمد جاوید ہمارے ملک کے چند گنے چنے صاحب علم اور صاحب

دانش شخص ہیں، علم نے جن کی سادہ اور لطیف شخصیت کو مغلوب نہیں کیا۔ وہ خبط عظمت کا شکار ہوئے نہ ہی زعم پارسائی ان پر حاوی ہو پایا، ہمارے بیشتر دینی سکالرز اور اہل دانش جس جال سے بچ نہیں پائے۔ احمد جاوید صاحب کی قدیم و جدید علوم پر گہری نظر ہے، وہ مولانا ایوب دہلوی جیسے غیر معمولی سکالر کے شاگرد ہیں۔ مولانا ایوب مرحوم بھی منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے بارے میں پڑھا اور سنا کہ وہ نہایت سادہ اور درویش منش انسان تھے، جم کر کتاب نہیں لکھی، مگر بولتے تو محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً علم کے موتی برستے۔ ان کی تقریروں کی مختلف کیسٹیں ریکارڈ ہوئیں، ان میں سے بعض تقاریر شائع بھی ہو چکی ہیں۔ رحیم یار خان سے محمد دین جوہر نامی ایک صاحب ''جی'' کے نام سے ایک علمی جریدہ نکال رہے ہیں۔ ادبی، علمی مراکز سے اتنا دور رہ کر انھوں نے کیسا کمال کام کیا، کم لوگ

جانتے ہوں گے۔ "جی" کے ان شماروں میں مولانا ایوب دہلوی کی تقاریر بھی شائع کی جارہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جوہر صاحب بھی احمد جاوید جیسے ہیں، ان کی فکر پر وہی نقش نمایاں ہیں۔ احمد جاوید کا پوسٹ ماڈرن ازم پر ایک مضمون، در حقیقت وہ ایک لیکچر تھا، پڑھنے کو ملا۔ پوسٹ ماڈرن ازم پر پہلے سے کچھ چیزیں دیکھ رکھی تھیں، اس ایک لیکچر نے مگر غیر معمولی وضاحت سے اس گنجلک نظریے کو پانی کر دیا۔ ڈاکٹر محمد امین نے بھی احمد جاوید کے مغربی فلسفے پر لیکچرز کا سلسلہ شروع کرایا تھا، اس کی دو تین قسطیں ان کے جریدے برہان میں پڑھیں۔ ہم جیسے طالب علموں کے دل سے دعا ہی نکلی۔

بات احمد جاوید سے نشست کی بات ہو رہی تھی۔ اپنے مخصوص عام فہم انداز میں خوبصورت، نفیس اور قابل غور نکات بیان کیے۔ ان سے سوال کیا کہ آج کے دور میں دین کی دعوت کا کام کرنے والوں

کے لئے نیا علم کلام ضروری نہیں ہوگیا۔۔۔۔ نیا ڈکشن، نیا اسلوب اور سائنٹفک دلائل؟ توقع تھی کہ وہ دانشورانہ جواب دیں گے۔ نہایت سادگی سے جواب دیا، یہ سب اپنی جگہ، مگر اصل کام تو خیر پھیلانے کا ہے۔ خیر پھیلانے سے بڑی دعوت کوئی نہیں، خیر کا ہر کام ایک اور خیر کو جنم دیتا ہے، یوں ایک ایسا نیک سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، جس میں ہر کوئی اپنے حصے کا خیر ڈالتا جائے تو یہ ایک کونے سے دوسرے تک چلا جائے گا۔ دوسرا یہ کہ خیر کی بات ایک دوسرے سے سیکھنی چاہیے، بعض چھوٹی چھوٹی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا اثر دیرپا اور دور تک چلا جاتا ہے۔ احمد جاوید بتانے لگے کہ میں نے بہت سی باتیں لوکل بس یا ٹرین میں سفر کرنے والے ساتھی مسافروں سے سیکھیں، جن کو بعد میں اپنی زندگی کا حصہ بنایا تو بڑا نفع ہوا۔

چند دن پہلے ایک دوست ملنے آئے، دوران گفتگو انہوں نے ایک ایسا واقعہ سنایا کہ دہل سا گیا۔ بتانے لگے کہ ان کے گھر گاؤں سے آئی ایک مائی کام کر رہی ہے۔ وہ اپنے چار پانچ بچوں کو پیچھے چھوڑ کر آئی تھی، ہر ماہ ان سے ملنے کے لئے چھٹی لے کر جاتی۔ ان کی اہلیہ اس پر خفا ہوتی کہ ہر ماہ یہ چار پانچ دن کے لئے غائب ہو جاتی ہے، اس کے پیسے کاٹنے چاہئیں۔ اسے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دیتے۔ ایک بار وہ ملازمہ گھر جانے کے لئے تیار تھی، خاتون خانہ نے شک گزرنے پر اس کا کپڑوں والا شاپنگ بیگ چیک کیا، پھر آواز دے کر خاوند کو بلایا کہ یہ دیکھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ اس میں گھر کے استعمال کی کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی چھپائی ہوئی تھیں۔ ان کی بیٹی کی استعمال شدہ گڑیا، جس کا چہرہ بھی بگڑ چکا تھا، نرسری کی ڈرائنگ بک، پرانے استعمال شدہ بال پین، گھسی گھسائی کلر پینسلیں، ٹوٹے پھوٹے بال

پین وغیرہ۔ ان کے ساتھ البتہ بالکل نیا شیمپو، دو لکس صابن، ایک ٹوتھ پیسٹ بھی شامل تھے۔ یقینی طور پر یہ سامان گھر کے لئے لائے گئے راشن میں سے چرایا گیا تھا، جسے کچن میں رکھنے کی ذمہ داری ملازمہ ہی کی تھی۔

وہ دوست بتانے لگے کہ میری اہلیہ بڑی برہم تھیں، ان کا ارادہ ہوا کہ ملازمہ کو سامنے بلا کر اس کی خوب خبر لی جائے، مگر میں نے روک دیا اور سختی سے ہدایت کی کہ یہ سامان واپس مت نکالو اور اس بات کا ذکر نہ کرنا۔ وہ کہنے لگے: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ چوری تھی، جس کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے، مگر میری ہمت نہیں ہوئی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میرے سامنے اپنے معصوم بچوں کے چہرے آ گئے اور ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ ہماری نوکرانی بھی ایک ماں ہے، اس کا بھی جی چاہتا ہوگا کہ بچے شیمپو سے سر دھوئیں، ٹوتھ پیسٹ

کریں اور خوشبودار صابن استعمال کریں۔ وہ ہمارے بچوں کو کلر پینسلوں سے تصویریں بناتے دیکھتی ہوگی تو اس کے من میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ گاؤں میں رہنے والے اس کے بچوں کو بھی ان کلر پینسلوں سے رنگ بھرنے کا موقعہ ملے۔ اس دن کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ہر ماہ کے راشن میں سے چند چیزیں اضافی لینی ہیں، بچوں کے لئے ہر ماہ سٹیشنری لینی پڑتی ہے، اب ان میں رنگا رنگ تصویروں والی کتاب اور پینسلوں کے پیکٹ کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہ سب ایک الگ لفافے میں ڈال کر چپکے سے اپنی ملازمہ کو دے دیتا ہوں کہ گاؤں جانا تو اپنے بچوں کے لئے لے جانا۔ کچھ سوئیٹس، کینڈیز چاکلیٹس بھی اس میں ڈال دیتا ہوں۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی، جس میں نمی چھپائے نہیں چھپتی۔ اس کے بعد بیگم صاحبہ نے دو تین بار چھاپے

مار کر سامان چیک کیا، مگر پھر انہیں کچھ ایسا نہیں مل سکا''۔ میرے دوست تو اپنی بات سنا کر چلے گئے، مگر اس کی چبھن ابھی تک محسوس ہو رہی ہے۔ بار بار یہ خیال آتا ہے کہ ہم اپنے گھروں میں کام کرنے کے لئے ملازمہ تو رکھ لیتے ہیں، جز وقتی تو شاید ہر دوسرے تیسرے گھر میں کام کرتی ہیں، بہت سے لوگ کل وقتی ملازمہ بھی رکھ لیتے ہیں، یہ خیال مگر نہیں آتا کہ تنخواہ کے علاوہ بھی کچھ دوسری خواہشات ہو سکتی ہیں۔ وہ مائی جو ہمارے بچوں کو وہ تمام شہری سہولتیں استعمال کرتے بلکہ ضائع کرتے دیکھتی ہیں، جن کا گاؤں میں تصور بھی نہیں تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہو گی؟ اس کا دل کیسے نہیں مچلتا ہو گا کہ اپنے بچوں کے لئے بھی یہ سب کرے، مگر کیا وہ ایسا کرنے کی پوزیشن میں ہوتی ہے؟ پہلی بار مجھے اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نہایت خوبصورت قول پوری طرح سمجھ

میں آیا، جس میں غلام کو اپنی طرح کھلانے، پہنانے کی ہدایت کی گئی۔

چند سال پہلے ایک صحافی دوست نے اپنے ایک سکالر دوست کا بتایا، وہ ان دنوں لاہور میں اکیلے رہتے تھے، ایک ملازم ان کے گھر کام کرتا تھا۔ وہ صاحب کئی سال مغرب میں رہے تھے، ان کی تربیت بھی ایک خاص نہج میں ہوئی۔ انہوں نے ملازم کی تنخواہ پاکستانی قانون کے مطابق کم سے کم اجرت کے حساب سے رکھی، حالانکہ اس سے دو تین ہزار کم پیسوں میں ملازم مل جاتا تھا، مگر ان صاحب کا کہنا تھا کہ نہیں، ہم میں سے ہر ایک کو لیبر لاز کا احترام کرنا چاہیے، کم سے کم اجرت سے نیچے کی ادائیگی ملازم کا استحصال ہوگا۔ پھر وہ ٹھیک آٹھ گھنٹے کے بعد ملازم کو رخصت دے دیتے کہ اب تمہاری ٹائمنگ ختم ہو چکی ہے، اگر کسی روز دو تین گھنٹے مزید روکنا پڑتا تو باقاعدہ

حساب کر کے اسے فی گھنٹہ کے حساب سے اوورٹائم دیتے۔ اتوار کی چھٹی لازمی ہوتی اور کوئی کام پڑنے کے باوجود ملازم کو نہ بلاتے، ایک آدھ بار ہنگامی حالات میں بلانا پڑا تو اسے ڈبل اوورٹائم ادا کیا کہ قانون یہی کہتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جس محفل میں یہ واقعہ سنایا، وہاں بیٹھے ہم سب لوگ دم بخود ہو گئے۔ سب لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھتے تھے، جنہیں دوران ملازمت ہر قسم کے استحصال سے عملی واسطہ پڑ چکا تھا، سنگ دل بھی ہم میں سے کوئی نہیں تھا، مگر سچی بات ہے کہ گھریلو ملازمین کے ساتھ اس نوعیت کی اخلاقی اور قانونی پاسداری کا خیال کسی نے کبھی نہیں کیا تھا۔ یہ کبھی خیال نہیں آیا کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں، بظاہر غیر اہم نظر آنے والی احتیاطیں دوسروں کے لئے کس قدر اہم ہو سکتی ہیں؟ ان کی زندگیوں میں آسانی لا کر ہم اپنی دنیا اور آخرت کس قدر آسان بنا سکتے ہیں؟

* * *

ٹائپنگ : حفیظ الرحمٰن

تشکر : حفیظ الرحمٰن جنہوں نے فائل فراہم کی

تدوین اور ای بک کی تشکیل : اعجاز عبید